U5486 Dell 8-1209

Title - KHUTBA-E-SADARAT

Creator - Sayyed Raas Masood

Publisher - Muslim University (Aligarh).

Date - 1930

Pages - 66.

Subjects - Khutbaat-O-Taqareer - Raas Masood; Raas Masood - Sawaneh-O-Tanqeed; Tazkira Mushaheer Aligarh.

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم
ونصلی علی رسولہ الکریم

سر کنم گریہ اگر تابِ شنیدن داری
سینہ بشگافم اگر طاقتِ دیدن داری

گزارش برادرانِ اسلام واحبابِ کرام! آج جب کہ آپ کے لطف وکرم سے مجھے اس اجلاس کی صدارت کا منصب حاصل ہے۔ حیران ہوں کہ کس زبان سے اس عزت افزائی کا شکرادا کروں۔ دل جذباتِ شکر گزاری سے معمور ہے اور زبان ادائے شکر سے قاصر۔

ابتدائی مرحلہ میں جب کہ کانفرنس آفس سے میرے نام حکم نامہ تعمیل ارشاد صدارت کانفرنس کا پہونچا تو میں نے طوعاً وکرہاً تعمیل حکم کا تو اقرار کر لیا لیکن اُسی کے ساتھ دو قطعے بھی لکھ کر پیش کر دیے جو میں یہاں نقل کرتا ہوں ؎

قطعہ

پس از چل سال ایں معنی محقق شد بہ ذاتی　　　　ہر عمل راست استحقاقِ دعوائے مسلمانی
بہ پیری حکم شد تا جامۂ فرسودہ چوں من　　　　صدارت را کند بدنام در بزم سخندانی

دیگر

بمن حکم آمد از ارکانِ تعلیمِ مسلمانی — کہ باشم صدر در بزمِ محاکاتِ سخندانی
بہ پیشِ حلقہ پوشانِ علومِ عقلی و نقلی — مرا شرم آید از بے مایگی خویش و عریانی

ساری عمر تو کانفرنس کے خادم کی حیثیت سے گزری۔ آج مخدوم بن کے بیٹھا ہوں حیران نہ ہوں تو اور کیا کروں۔ ایک اور مشکل ہے وہ یہ کہ مدت العمر میں نے ہر ایک موقعہ پر ہمیشہ زبانی برجستہ اور فی البدیہہ تقریر کی ہے۔ آج بہ تعمیل حکم اس بدعتِ حسنہ کا مرتکب ہونا پڑا ہے کہ اپنا نامۂ اعمال تحریری پیش کروں۔ لہذا سخت حیران ہوں کہ اب تو کوئی جگہہ مفر کی باقی نہیں رہی۔ زبانی غلطیوں اور لغزشوں سے انکار بھی کیا جا سکتا ہے اور انحراف بھی لیکن تحریری اقرار نامہ سے کیوں کر انحراف و انکار کیا جائے اور اگر کیا بھی گیا تو مانا کس نے ؟ غرض کہ ہر طرح مشکل ہی مشکل ہے اور سوائے آپ صاحبوں کے رحم کے اور کوئی چارۂ کار نہیں۔ میرا عاجزانہ اور غیر کافی شکریہ قبول فرمائیے اور میری لغزشوں پر پیشگی پروانہ معافی عطا کیجئے۔ بہر حال بمقتضائے شعر ؎

خیالِ خاطرِ احباب چاہئے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

اپنی داستانِ دردِ دل جس کو میں اپنے وصیت نامہ سے تعبیر کرتا ہوں بہ کمال دردمندی و جذباتِ مخلصانہ پیش کرتا ہوں۔ ردّ و قبول بدستِ شما ؎

حافظ وظیفۂ تو دعا گفتن ست و بس
در بندِ آں مباش کہ نشنید یا شنید

شکرِ منّت

خدا تعالیٰ کی ناشکر گزاری ہوگی اگر یہ کہوں کہ اس نے مجھے خدمت کا کوئی موقع نہیں دیا۔ بے شبہ میں نے اس کی توفیق سے ملک و ملّت کی کچھ ناچیز خدمات کی ہیں لیکن وہ خدمات ایسی نہیں کہ میں اُن کے عوض میں منصبِ جلیل کی آرزو کرتا۔ مجھ سے جب کبھی جو کچھ بن آیا کیا لیکن ایک رہنما یا لیڈر کی حیثیت سے کبھی پبلک کے سامنے نہیں آیا۔ محض خدمت مقصود تھی۔ نہ ستایش کی تمنّا نہ صلہ کی پروا۔ بہرحال جب کہ آپ نے ازراہِ اخلاص و محبت یہ منصب مجھے عنایت کیا ہے تو میرا فرض ہے کہ اظہارِ منّت پذیری کروں۔

حضرات! جیسا کہ عرض کر چکا ہوں۔ اگرچہ صدارت و رہنمائی کا جذبہ کبھی دل میں پیدا نہیں ہوا لیکن ع

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

اس لئے کہ گزشتہ نصف صدی میں قومی مجالس کے بڑے بڑے ولولہ انگیز مناظر ان آنکھوں نے دیکھے اور اُن کے اہتمام و انصرام میں شرکت کی۔ کچھ کہا بھی اور بہت کچھ سنا بھی۔ سرسید کو دیکھا اور برتا۔ سات سال کی عمر سے یہ سلسلۂ ارادت شروع ہوا تھا

حلقۂ پیرِ مغانم ز ازل در گوش است
ما ہمانیم کہ بودیم و ہماں خواہد بود

نیز اُن کے جانشین نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کو دیکھا اور ان کے ساتھ کام کیا اور کام کا صلہ ہمیشہ یہ سمجھا کہ ہماری سعی و محنت بارآور ہو اور ہم اپنی قوم کو اُبھرتا اور آگے بڑھتا ہوا دیکھ کر حقیقی مسرت حاصل کریں لیکن کس قدر حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا جاتا ہے ہماری قوم کا قدم پیچھے ہٹتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اب قومی جلسے بھی بے کیف نظر آتے ہیں۔ اور سرسیّد مرحوم کے عہد میں جو روح ان جلسوں میں کام کرتی تھی۔ اب اس کے دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں۔ حیران ہوں کہ کیا کہوں اور کیسے کہوں ؎

پہلو بشگافید و ببینید دلم را
تا چند بگویم کہ چنان ست و چنان نیست

حضرات! آپ بخوبی جانتے ہیں کہ علی گڑھ کی تحریک سے میرا تعلق آج کا نہیں ہے بلکہ اس تعلق کی عمر اس کانفرنس کی عمر سے زیادہ ہے یعنی نصف صدی سے متجاوز ہے اور اس عظیم الشان مرکزی تعلیم گاہ کی ترقی و عروج کے تمام تدریجی منازل میرے پیش نظر ہیں۔ اس لئے آج جب کہ میں اس کرسی پر بیٹھا ہوں میرا دل عجیب و غریب جذبات سے معمور ہے۔ عہد گزشتہ کا مرقّع میری آنکھوں کے سامنے ہے جس میں سرسید اور ان کے رفقا و جانشینوں کی چلتی پھرتی صورتیں مجھے نظر آرہی ہیں۔ جو سب یکے بعد دیگرے میری آنکھوں

کے سامنے آئے اور اپنا اپنا عہد فیض رساں پورا کر کے چلے گئے۔ یقین کیجئے کہ یہ مرقع ہماری گزشتہ شصت سالہ جدو جہد کی تاریخ ہے۔ جس میں عبرت و بصیرت کی بہت سی داستانیں پنہاں ہیں لیکن صرف حقیقت شناس نگاہیں ان داستانوں کو پڑھ سکتی اور واقعات سے عبرت حاصل کر سکتی ہیں۔

تحریک علی گڑھ

حضرات! تحریک علی گڑھ کی تاریخ اتنی بار دُہرائی گئی ہے کہ اب اس میں کوئی لطف نہیں رہا اور جدّت پسند طبیعتیں اب تازہ داستانوں سے لطف اندوز ہونا چاہتی ہیں لیکن میں عرض کروں گا کہ

۵ داستانِ عہدِ گل را از نظیری بشنوید
عندلیب آشفتہ تر گفت است ایں افسانہ را

اگر اجازت ہو تو اس موقع پر نظیری کی جگہ "از مزمل بشنوید" عرض کر دوں مجھے اس موقع پر تحریک علی گڑھ کی مفصل تاریخ یا سرسید مرحوم کے سوانح حیات بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ یہ عرض کروں گا کہ وہ کون سے حالات تھے جو اس تحریک کے وجود میں آنے کا باعث ہوئے اور اس سلسلہ میں ہم نے کیا کام کیا اور کیا کرنا ہے؟ اس تحریک کا آغاز ایسے زمانہ میں ہوا جو ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ کا سب سے زیادہ اندوہ ناک باب ہے اور وہ اس لئے بھی اندوہ ناک ہے کہ خاتمۃ الباب ہے یہی زمانہ ہے کہ جب سرسید ہندوستان کے دارالحکومت دہلی میں پیدا ہوئے۔ اس عہد میں اسلامی حکومت کا واقعی طور پر تو خاتمہ

ہو چکا تھا۔ لیکن دہلی کے لال قلعہ میں ابھی دولتِ مغلیہ کے آخری جانشین اپنی زندگی کے تلخ ایّام حسرت و یاس کے ساتھ گزار رہے اور سفر کے لئے پا بہ رکاب تھے۔ پھر جب سرسید نے ہوش سنبھالا تو یہ دیکھا کہ یہ آخری قافلہ بھی جا چکا ہے اور لال قلعہ ان برگشتہ بخت جانے والوں پر اشکِ خونیں بہا رہا ہے۔ یہ حسرت ناک واقعہ اور تاریخ ہند کا یہ زبردست انقلاب ایسا نہ تھا جو سرسید کے دل و دماغ سے محو ہو جاتا۔

اس کے بعد انھوں نے وہ ہنگامۂ زلزلہ افگن دیکھا جو ۱۸۵۷ء میں برپا ہوا۔ اُنھوں نے دیکھا کہ دست بُرد حوادث نے اُن کی قوم کو بُری طرح برباد کر دیا۔ اس واقعہ سے انھوں نے عبرت حاصل کی اور بصیرت بھی۔ ایسے واقعات عموماً کمزور دلوں میں مایوسی و ناامیدی پیدا کرتے ہیں۔ لیکن مضبوط دل و دماغ میں ہمّت و حوصلہ اور جوش و ولولہ۔ یہ کہنے کی حاجت نہیں کہ سرسیّد آخر الذکر لوگوں میں تھے۔ اس لئے یہ حالت دیکھ کر وہ فکر میں مبتلا ہو گئے کہ مسلمانوں کو آیندہ اس ملک میں کس طرح رہنا چاہئے اور کیا کرنا چاہئے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب کسی ملک میں جدید حکومت قائم ہوتی ہے تو وہ اپنے آئین و قوانین کے ماتحت ایک خاص نظام حکومت کی بنیاد رکھتی ہے اور اس کی ایک کوشش یہ بھی ہوتی ہے کہ مفتوحہ ملک میں اپنی زبان تہذیب اور علوم کو رواج دے۔ اگرچہ انگریزی حکومت کے ابتدائی دور میں انگریزی

زبان اور علوم مغربیہ کی اشاعت کے لئے کوئی نمایاں کوشش نہیں کی گئی۔ بلکہ بجائے اس کے علوم مشرقی کی سرپرستی اور اشاعت کا خاص اہتمام کیا گیا۔ لیکن یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ بتدریج حکومت ایسے افراد تیار کرنے کی کوشش کرے گی جو اس کے دفتری نظام کو سنبھال سکیں اور اس کی طرز حکومت کو سمجھیں اور اس کی قدر کریں۔ یہ ظاہر تھا کہ حکومت کے عام دفاتر اور مختلف عہدوں کے لئے انگلستان سے آدمی مہیّا نہیں کئے جا سکتے تھے بلکہ اُن کا اسی ملک میں تیار کرنا ضروری تھا تاکہ حکومت کی مشین کم خرچ سے چل سکے اور ہندوستان کو یورپین کلچر سے روشناس کیا جائے۔ لارڈ میکالے پہلے شخص تھے جنہوں نے اس پالیسی کی بابت ایک شاندار یادداشت مرتّب کی غرض سب سے پہلے برادرانِ وطن نے حکومت کی اس ضرورت کا احساس کر کے انگریزی پڑھنے پر توجہ کی۔ لیکن مسلمانوں نے کچھ تو مذہبی وجوہ سے اور کچھ اس خیال سے کہ جو بڑے عہدے اس عہد میں ہندوستانیوں کو مل سکتے تھے وہ مشرقی علوم کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بے تامّل مل جاتے تھے انگریزی پڑھنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ لیکن سر سید جانتے تھے کہ یہ حالت عارضی ہے اور جب حکومت کے دفاتر دیگر اقوام سے بھر جائیں گے تو مسلمانوں کے لئے سرکاری محکموں میں کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی اور مسلمان مغربی تعلیم اور اس کے مفید اثرات و ثمرات کے حاصل کرنے میں اس قدر پیچھے رہ جائیں گے کہ پھر

ترقی کی دوڑ میں پیش رو اقوام کا ہم عنان ہونا سخت دشوار بلکہ ناممکن ہو جائے گا
سر سید یہ بھی جانتے تھے کہ بحالت موجودہ مسلمان تجارت پیشہ اور کاروباری قوم نہیں ہیں۔ گزشتہ زمانہ میں ان کے ذرائع معاش زیادہ تر حکومت سے وابستہ تھے اب حکومت بدل جانے کے بعد وہ ان ذرائع معاش سے اس وقت تک مستفید نہیں ہو سکیں گے جب تک حکومت کی زبان سیکھ کر اپنے کو جدید زمانے کے لئے موزوں نہ ثابت کریں۔

سر سید کا مقصد یہ حالات واسباب تھے جن کی بنا پر سر سید نے یہ فیصلہ کیا کہ بحالت موجودہ مسلمانوں کے لئے صرف ایک ہی طریقہ اپنی ہستی قائم رکھنے اور ترقی کرنے کا ہے جو یہ ہے کہ مسلمان اعلیٰ مغربی تعلیم حاصل کریں۔ سر سید اس رائے پر یہاں تک مضبوط و مستقل تھے کہ وہ کسی دوسری اصلاحی یا تعلیمی اسکیم پر غور کرنے کے لئے بھی آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ اس وقت مسلمانوں کو ہر کام سے دست کش ہو کر صرف ایک مقصد پیش نظر رکھنا چاہیے۔ غرض ان کی تمام تر کوشش تعلیم اور وہ بھی مردوں کی تعلیم کے لئے وقف تھی اور اسی تعلیمی تحریک کی بنا پر اُن کو مذہبی مباحثوں میں بھی مُبتلا ہونا پڑا۔ کیوں کہ مسلمانوں میں ایک جماعت ایسی بھی تھی جو مذہبی نقطۂ نظر سے انگریزی تعلیم کی مخالف تھی۔ اس لحاظ سے وہ سر سید کی تحریک کے لئے سنگِ راہ تھی۔ لہذا سر سید نے یہ بھی اپنا فرض سمجھا کہ وہ بتائیں کہ انگریزی پڑھنا

مذہبی حیثیت سے ناجائز نہیں ہے۔ اس ایک مسئلہ کے سلسلہ میں اور بہت سے مذہبی مسائل چھڑ گئے اور سرسید نے تہذیب الاخلاق اور اپنی دوسری تصانیف کے ذریعہ مذہبی عقائد اور مسائل پر بہت کچھ لکھا۔ لیکن اپنا اصل مقصد پیش نظر رکھا۔ سرسید کے رفقاء کار میں سے اُن کے بعض مخلص ترین رفیق بھی سرسید کے مذہبی خیالات کے مخالف تھے۔ لیکن اُس زمانہ کی خوبی اور اُن حضرات کی صفائی قلوب وایثار کی یہ حالت تھی کہ باوجود اس اختلاف کے سرسید کے قومی جذبات کی پوری قدر کرتے تھے اور قومی اصلاح میں ہمہ تن اُن کے معین اور معاون تھے۔ میں اگرچہ اس وقت طفلِ مکتب تھا لیکن یہ سمجھتا تھا کہ تیرہ سو سال کے بعد یہ مستقیم مذہب جس نے ایسے ہزاروں جزر و مد دیکھے ہیں۔ اس تراش وخراش کا ہرگز متحمل نہیں ہو سکتا بہرحال اگر ایک طرف وہ مذہبی بحث میں مصروف تھے تو دوسری طرف ایک ایسی درس گاہ کی بنیاد رکھ رہے تھے جس کا مکمل خاکہ اُن کے تخیل میں تھا۔ اگرچہ ابھی تک چند معمولی دیواروں اور جھونپڑوں کا نام کالج تھا لیکن سرسیّد مرحوم جیسا بلند نظر اور صاحب حوصلہ انسان مستقبل کے آئینہ میں ایک ایسی عظیم الشان اور وسیع عمارت کا نقشہ دیکھ رہا تھا جو تمام مسلمانانِ ہند کی تعلیم کا مرکز اور ہندوستان میں مغربی علوم کا سرچشمہ ہوگی۔

علی گڑھ کا انتخاب

حضرات! جیسا کہ آپ کو معلوم ہے جب سرسید نے یہ ارادہ کیا کہ جدید تعلیم کے لئے ایک دارالعلوم کا سنگ بنیاد

رکھیں تو انھوں نے بجائے دہلی کے اس مقصد کے لئے علی گڑھ کو منتخب کیا۔ دہلی اُن کا وطن تھا اور انھوں نے اپنے بچپن اور عنفوانِ شباب میں اس وطن کی چہل پہل بھی دیکھی تھی اور اگرچہ اس وقت دہلی کی شان وشوکت رخصت ہو چکی تھی تاہم اس دورِ آخر میں بھی گزشتہ عظمت کی ایک جھلک نظر آتی تھی۔ مگر جب انقلاب ۱۸۵۷ء میں انھوں نے اپنے وطن عزیز کی آخری بربادی دیکھی تو اُن کے دل پر گہرا اثر ہوا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ برباد شدہ دہلی کا اندوہ ناک منظر ہمیشہ ان کے سامنے رہے۔ لہذا انھوں نے علی گڑھ کو اپنی تعلیمی تحریک کا مرکز بنایا۔ وہاں اور وہاں کے ملحقہ اضلاع میں شرفا کے متعدد قدیم خاندان موجود تھے جو علاوہ امارت کے اپنی وضع داری اور قدیم مشرقی اخلاق کے لحاظ سے بھی ممتاز تھے اور یہ واقعہ ہے کہ اُن شرفا سے سرسید کو کافی مدد ملی اور انکی تحریک کو قوت پہونچی۔ ان شرفا نے ہر مشکل اور نازک موقع پر سرسید اور اُن کے جانشینوں کی مالی و اخلاقی مدد کی۔ اور اب تو علی گڑھ تحریک کی تائید و حمایت ان کی خاندانی روایات میں داخل ہو گئی ہے اور آج بھی وہ اس تحریک کے حامی و ہوا خواہ ہیں۔

آج سرسید کی تعلیمی تحریک پر تقریبًا ساٹھ ۶۰ برس کا زمانہ گزر چکا ہے سرسید کے بعد اُن کے رفقا اور جانشینوں کے عہد میں یہ تحریک پھلی پھولی۔ اور اس کے نتائج سب کے سامنے آ گئے یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار

نہیں کیا جاسکتا کہ گزشتہ ساٹھ برس میں اگر مسلمانوں نے کوئی قومی کام مجموعی قوت سے مضبوط و مستحکم بنیاد پر کیا ہے تو وہ علی گڑھ کالج کا قائم کرنا اور اس کا مسلم یونیورسٹی کے درجہ پر پہونچانا ہے۔ یوں تو مسلمانوں نے اپنے عہد عروج و اقبال میں بڑے بڑے کام کئے ہیں۔ مگر دورِ تنزّل میں جب کہ ان کی عملی قوتیں مردہ ہو چکی تھیں اور ہر طرف مایوسی و ناکامی کا سامنا تھا اتنا عظیم الشان کام کر دکھانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ مسلمانوں کے عہد ترقی کی یادگاریں تو ہندوستان میں بہت ہیں لیکن مسلم یونیورسٹی کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ ان کے عہدِ تنزّل کی یادگار ہے۔

حضرات! گزشتہ پچاس ساٹھ سال میں ہماری زوال پذیر قوم میں جتنے بہترین دل و دماغ اور جتنے ارباب کمال پیدا ہوئے اُن میں سے اکثر نے اپنے دل و دماغ کی بہترین قوتیں علی گڑھ تحریک کی ترقی و کامیابی کے لئے صرف کر دیں۔ نیز ہماری قوم نے اس مقصد کے لئے مالی قربانی سے بھی دریغ نہیں کیا۔

اجرش دہد خدائے کہ کردند یاوری
با آں کساں کہ ناصر و یاور نداشتند

لیکن یہ سلسلۂ دور و تسلسل ہنوز ناتمام ہے۔ بہت کچھ کیا اور بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ مسئلۂ تعلیم ایک ایسا شاندار مسئلہ ہے کہ اس کے حل میں بڑے بڑے

عقلاء حیران رہے ہیں۔ یورپ جو تعلیم کی عروج کے انتہائی درجہ کے قریب ہے، آج بھی تعلیمی مسائل کے کرید بن میں مصروف ہے۔

مسلمانوں کی تعلیم کا مسئلہ اس سے زیادہ پیچیدہ ہے جس قدر کہ سمجھا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو تعلیم کے ساتھ مذہب اور معاشرت کو بھی رکھنا ہے اور اس مسئلہ کج دار و مریز کے واسطے سخت احتیاط کی ضرورت ہے ؎

بر کفے جام شریعت در کفے سندان عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

لہذا میری رائے ناقص میں مسلمانوں کو ہنوز ارتقائی تعلیم کے مسئلہ سے غافل نہ ہونا چاہیئے۔ اس مسئلہ کے حل کے متعلق جو تدابیر کی گئی ہیں اُن میں آپ کی ایجوکیشنل کانفرنس بھی ایک جزوِ اعظم ہے۔

ایجوکیشنل کانفرنس

یہ کانفرنس جس میں آج آپ تشریف فرما ہیں ہماری قوم کے بڑے بڑے مشاہیر اور ارباب فضل و کمال کا خیر مقدم کر چکی ہے اور اس پلیٹ فارم پر والیان ملک بلند پایہ حکام اور قوم کے نامور لیڈروں نے اپنے پیام ملک و ملت کو سنائے ہیں۔ اسی پلیٹ فارم پر سر سید کی گرجتی ہوئی آواز قوم میں تحریک عمل پیدا کرتی تھی۔ اسی پلیٹ فارم پر نواب محسن الملک کی فصاحت و بلاغت سامعہ نواز ہوتی تھی۔ اور نواب وقار الملک کی سنجیدہ و پُر مغز تقریروں سے قوم فائدہ اُٹھاتی تھی! وہی مقام

تھا جہاں مولوی نذیر احمد کی جادو بیانی دل و دماغ پر قبضہ کرلیتی تھی۔ اور یہی مجلس تھی جہاں مولنٰا حالی مرحوم نے بارہا دلگیر آواز میں قوم کا مرثیہ سُنا کر دلوں کو بیتاب اور آنکھوں کو اشک بار بنا دیا تھا، اور یہی جگہہ تھی جہاں موجودہ عہد کے جلیل القدر اسلامی مورّخ اور یگانۂ روزگار مصنّف علّامہ شبلی نعمانی نے اپنے محققانہ تاریخی مضامین اور زلزلہ افگن قومی نظمیں سُنا کر حاضرین پر ایک عالمِ کیف و سرور طاری کر دیا تھا۔ غرض کہاں تک عرض کیا جائے۔ مختصر یہ ہے کہ گزشتہ اڑتالیس سال میں غالباً ہماری قوم کی کوئی نامور ہستی ایسی نہ تھی جو کانفرنس کے پلیٹ فارم پر نہ آئی ہو، اور بہت سے ایسے بھی ہیں جو اسی پلیٹ فارم پر آکر قوم میں روشناس ہوئے اور آگے بڑھے ؎

نہ من زبے عملی در جہاں ملولم و بس
ملالتِ علما ہم زعلمِ بے عمل ست

حضرات! یہ کانفرنس اس عہد کی یادگار ہے جب کہ انحطاط و زوال کے بعد مسلمان از سرِ نو تعمیری کام کی بنیاد رکھ رہے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ اپنی قوم کی منتشر و پراگندہ قوتوں کو جمع کرکے اجتماعی طاقت سے ملک و ملت کی کوئی خدمت انجام دیں، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس معاملہ میں کانفرنس کو کامیابی حاصل ہوئی اور اس نے قوم کے اکثر و بیشتر افراد کو ایک مقصد اور

ایک نصب العین پر متحد کردیا۔ اور وہ مقصد اس زمانہ میں یہ تھا کہ مسلمان علوم جدیدہ کی تعلیم حاصل کر کے اپنے کو زمانۂ موجودہ کی ضرورت کے لائق بنائیں تاکہ حکومت کے ہر شعبہ و محکمہ میں داخل ہو کر اپنی قومی و سیاسی اہمیت قائم رکھ سکیں۔ کانفرنس کا یہ بھی اہم ترین فرض ہے کہ وہ مسئلۂ کج دار و مریز یعنی مسلمانوں کی تعلیم اور مذہب۔ مسلمانوں کی حسن معاشرت اور سوسائٹی میں اُن کی عزت اور وقار کی تدابیر سے غافل نہ ہو۔ سرسید نے مسلمانوں کی حکومت کا زوال دیکھا تھا اور وہ اس زوال و انقلاب کے اسباب سے واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اب مسلمانوں میں یہ صلاحیت و طاقت موجود نہیں ہے کہ مستقبل قریب میں دوبارہ حاکمانہ عروج و اقتدار حاصل کر سکیں، اس لئے وہ چاہتے تھے کہ بحیثیت ایک محکوم قوم کے مسلمان جس قدر زیادہ سے زیادہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔ بڑھیں۔ اور انتظام حکومت میں دخیل ہو کر اپنی پوزیشن کو مضبوط و مستحکم بنائیں۔ اگرچہ سرسید کی یہ تحریک ایک تعلیمی تحریک تھی لیکن اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ جو قوم حکومت کے ہر محکمہ و شعبہ میں داخل ہو کر انتظام حکومت پر حاوی ہو جائے گی۔ اس کو کوئی سیاسی اہمیت حاصل نہ ہو گی۔

غرض حاصل کلام یہ کہ سرسید کا ایک مقصد تھا اور وہ اس مقصد کے لئے اس کانفرنس کے ذریعہ سے قوم کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر رہے تھے۔ اُن کے زمانہ میں یہ انتشارِ افکار و خیالات نہ تھا جو آج رونما ہے۔ جیسا کہ میں

عرض کر چکا ہوں۔ بے شبہ اس زمانہ میں بھی ایک جماعت مذہبی نقطۂ نظر و اخلاص نیت سے سرسید کے خیالات و اعمال کی مخالف تھی اور ہمیشہ رہی، لیکن ایک کثیر جماعت ایسی بھی تھی جو سرسید کی ہم آہنگ تھی، اور قومی ترقی کے لئے اُن کی مساعی جمیلہ کو بہ نظرِ استحسان دیکھتی اور دنیوی معاملات میں ان کو اپنا لیڈر تسلیم کرتی تھی۔ اور اس خیال کے سب مسلمانوں کا پلیٹ فارم یہ کانفرنس تھی، اور یہاں سے جو آواز بلند ہوتی تھی سارے ملک میں پھیل جاتی۔ اور لوگ قولاً و عملاً اس کی تائید کرتے تھے۔ لیکن وائے بر حالِ ما کہ آج مسلمانوں میں یہ اتحادِ فکر و عمل باقی نہیں رہا۔ ہنگامہ آرائی ہے۔ جوش و خروش ہے۔ اخبارات ہیں۔ انجمنیں ہیں۔ غرض سب کچھ ہے لیکن کوئی ایک مقصد و نصب العین نہیں ہے۔ کوئی تعلیمی و سیاسی مرکز نہیں ہے۔ کاش تاریخ پھر اپنا اعادہ کرے اور ہم ایک دفعہ پھر کم از کم تعلیمی معاملات میں ایک مقصد پر جمع ہو سکیں۔ ع

باز ہوائے چمنم آرزوست

افسوس ہے کہ آج کل تعلیمی مسائل سیاسی کشمکش اور جدید تحریکوں کے سامنے نظر انداز کر دیے گئے ہیں ؎

افسوس کہ قومِ ماست درحالِ تباہ بالبغض و عداوت ست ہر یک ہمراہ
گم شد ز میانہ راہِ اخلاصِ عمل اِنّا لِلّٰہ ثُمَّ اِنّا لِلّٰہ

مسلمانوں کی تعلیمی جدوجہد

حضرات! ہر نیا کام جب شروع کیا جاتا ہے تو وہ ایک تجربہ کی حیثیت رکھتا ہے، اور کچھ مدت بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تجربہ کس حد تک کامیاب یا ناکامیاب رہا۔ اگرچہ دوسری قوموں کی زبان وعلوم سیکھ کر اس میں تبحر وکمال حاصل کرنا مسلمانوں کے لئے کوئی نیا تجربہ نہیں، انھوں نے نہ صرف دوسری قوموں کے علوم حاصل کئے۔ بلکہ اُن علوم کی خامیاں دور کرکے ان کو ترقی دی اور مرتبہ کمال پر پہونچا دیا بلکہ اس حد تک تصرف کیا کہ ان علوم نے اسلامی سانچہ میں ڈھل کر ایک جدید صورت اختیار کرلی اور وہ پہلے سے بھی زیادہ مفید وکارآمد ہوگئے لیکن یہ سب تجربے ہمارے عہدِ عروج واقبال کے تھے، جب کہ ہماری دماغی قوتیں ترقی پذیر تھیں۔ ہمارے حوصلے بلند تھے۔ دلوں میں اُمنگ تھی اور اپنی برتری کا احساس، علم کی تشنگی تھی اور اس تشنگی کے بجھانے کے لئے ہم بادیہ پیمائی وصحرانوردی میں مصروف تھے۔

اسی دورِ عروج میں ہم نے ارسطو وافلاطون کے مسائل فلسفہ وحکمت بھی سیکھے، مگر ہم نے ان علوم میں اس قدر کمال حاصل کیا کہ خود اُستاد بن گئے اور رازی۔ فارابی۔ ابن سینا اور ابن رشد وغیرہم جیسے حکماء ہم میں پیدا ہوئے ہم نے یہ علوم آنکھیں کھول کر ناقدانہ نظر سے پڑھے اور ان کی گہرائی تک پہونچے۔ جو صحیح تھا قبول کیا۔ جو غلط تھا اُسے ٹھکرا دیا اور اس کا تار و پود

بکھیر دیا یعنی خذ ما صفا ودع ما کدر کے اصول پر پورا پورا عمل کیا۔ یہاں تک کہ فلسفہ کے مقابلہ میں ہم نے علم کلام پیدا کیا اور اس میں ایسی ایسی موشگافیاں کیں اور لطیف و نازک مضامین پیدا کئے کہ علمی دنیا کو ہماری نکتہ دانی کا اعتراف کرنا پڑا۔

بے شبہ ہم ارسطو اور افلاطون کی عزت کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھتے کہ یہ لوگ بارگہِ خاص کے رازداں نہیں ہیں اور ما اوتیتم من العلم الا قلیلا کے کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ غرض غیروں کے علوم سیکھنے کا ہمارا گزشتہ تجربہ عہد عروج سے تعلق رکھتا تھا جو اس لحاظ سے کامیاب رہا کہ ہم نے ان علوم کو ترقی دے کر مرتبۂ کمال پر پہنچایا اور خاص بات یہ ہے کہ اُن کو اپنے مذہب کا خادم بنا کر ان کے ذریعہ سے اسلامی مسائل و احکام کی برتری و حقانیت تمام دنیا پر ثابت کی۔ یہ ہمارا ایسا علمی و مذہبی کارنامہ ہے جس کی نظیر کسی اور قوم کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

تعلیم جدید کے نتائج و ثمرات

اب دوسرے دور پر توجہ کیجئے۔ جب کہ ہم نے ہندوستان میں بحالت محکومی یہ تجربہ کرنا چاہا کہ مغربی علوم سیکھ کر اپنی قومی ترقی کے اسباب مہیا کریں۔ اب اس تجربہ پر نصف صدی سے زیادہ زمانہ گزر چکا ہے اور ہم اتنی طویل مدت سے آنکھ بند کئے ایک راستہ پر چل رہے ہیں اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ذرا ٹھہر جائیں اور غور کریں کہ کیا ہم غلط

راستہ پر تو نہیں جا رہے اور ایسا تو نہیں ہے کہ منزلِ مقصود ہم سے دور ہو گئی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اپنی گزشتہ شصت سالہ جدوجہد اور کارگزاری کا جائزہ لیں، اور یہ دیکھیں کہ اس کے جو نتائج و ثمرات ظاہر ہوئے وہ کیسے ہیں اور اب زمانہ کے حالات کس چیز کے مقتضی ہیں ہمیں اپنے طریقہ کار پر اس لئے بھی نظرِ ثانی کی ضرورت ہے کہ گزشتہ پچاس برس سے تغیر و انقلاب کا زبردست سلسلہ دنیا میں جاری ہے جس نے انسانی خیالات و افکار، عادات و طرزِ معاشرت تہذیب و اعمال پر زبردست اثر ڈالا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ہم حالاتِ حاضرہ کی روشنی میں اپنے تعلیمی پروگرام پر نظر کر کے از سرِ نو ایک شاہراہِ عمل متعین کریں۔

جب مسلمانوں نے گزشتہ صدی کے نصف آخر میں سرسید کی تحریک سے انگریزی تعلیم پر توجہ کی تو ان کے دل خوش گوار امیدوں سے معمور تھے اور عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ جدید تعلیم حاصل کرنے کے بعد مسلمانوں کی ترقی کا ایک نیا دور شروع ہو گا یعنی علمی اخلاقی تمدنی اور مالی حیثیت سے ان کا مرتبہ بلند ہو جائے گا۔ اور وہ انتظامِ مملکت میں شریک کار ہو کر اپنی اصلی پوزیشن حاصل کر لیں گے۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ امیدیں پوری نہیں ہوئیں بلکہ حالات اور زیادہ ابتر ہو گئے اور ہم نے اس تعلیم سے جو کچھ حاصل کیا اس سے زیادہ ضایع کر دیا ہے

بودیم بہ فکر سود و کردیم زیاں
تعجیل نمودیم ز تدبیر شدیم

یہ واقعہ ہے کہ اس تعلیم پر ہم نے اپنی صحت و دولت کے علاوہ اسلامی تہذیب و شائستگی، مشرقی علوم و فنون، قومی غیرت و عصبیت، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسلامی روح کو بھی قربان کر دیا، اور یہ سب کچھ قربان کرنے کے بعد چند ڈگریاں حاصل کیں جن کی بازار میں جو قیمت ہے وہ ظاہر ہے، اور جو آج نامہ اعمال کی طرح ہمارے ہاتھ میں ہیں اور ہم انھیں لئے ہوئے تلاش معاش میں سرگرداں در بدر پھرتے ہیں لیکن ہر جگہ سے صاف جواب پاتے ہیں اور یہ سب ناکامیاں مستقبل کا خوش گوار خواب دیکھنے کے بعد اس وقت پیش آتی ہیں جب کہ زندگی کا وہ دور جس میں عملی قوتیں شباب پر ہوتی ہیں گزر جاتا ہے اور ہمت اس قدر پست ہو جاتی ہے کہ کسی نئے میدانِ عمل میں قسمت آزمائی کا موقع باقی نہیں رہتا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ یہ مایوسی و حرماں نصیبی ہزاروں نوجوانوں کی زندگی کو برباد کر دیتی ہے، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یہ ناکامی جذبۂ غضب و انتقام کو ابھار کر ان کو انقلاب پسند بنا دیتی ہے گویا بیکار نوجوانوں کا وجود ہندوستان کے امن و عافیت کے لئے ایک مستقل خطرہ ہے جس سے مستقبل قریب میں اگر یہی لیل و نہار ہیں تو نجات کی کوئی صورت نہیں، آپ کسی ناکام انسان کو یہ کہہ کر مطمئن نہیں کر سکتے کہ علم کا مقصد ملازمت

نہیں ہے بلکہ علم کو محض علم کی خاطر حاصل کرنا چاہئیے۔ جب کہ پڑھتے وقت پڑھنے اور پڑھانے والے کسی کی یہ ذہنیت نہ تھی کہ علم بجائے خود ایک مقصد ہے تو آج ناکامی کے بعد اُن پر یہ سربستہ راز ظاہر کرنا کس قدر مضحکہ انگیز ہے۔

نظامِ تعلیم پر نظرِ ثانی کی ضرورت

یہ غنیمت ہے کہ ہماری قوم کے بعض صاحبِ بصیرت بزرگوں کو گزشتہ جنگ عظیم کے بعد ہندوستان کی سیاسی و اقتصادی حالت دیکھ کر اس خطرہ کا احساس ہوا اور وہ سمجھنے لگے ہیں کہ جب تک موجودہ طریقہ تعلیم میں زبردست تبدیلیاں نہیں کی جائینگی بیکار نوجوانوں کی تعداد بڑھتی جائے گی اور ملک مصیبت میں مبتلا ہو جائے گا۔ آپ کی کانفرنس کے ایک لائق و تجربہ کار صدر سر شیخ عبدالقادر نے ۱۹۲۶ء میں فرمایا تھا:

"اگر آپ کے یہاں تعداد طلبہ ترقی کرتی جائے جیسا کہ اغلب ہے کہ ہوگا اور آپ اپنی تعلیم کی نوعیت میں کوئی ترمیم یا اصلاح نہ کریں تو تھوڑے عرصہ میں بے روزگاروں کی تعداد لاکھوں تک پہونچ جائے گی۔ یہ ایسا خوفناک مستقبل ہے کہ کوئی ملک اس کا خیال بے فکری سے نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اب ایسا وقت آ گیا ہے کہ آپ ایسی تعلیم پر قناعت نہ کریں جو رسمی نوشت و خواند اور عام واقفیت کے لیئے ایک معمولی درجہ کی تحصیل پر ختم ہو جاتی ہے۔ بلکہ آپ کو چاہیئے کہ اپنے مدارس میں نصاب کو اس طرح بدلیں کہ طلبہ اپنی روزی آپ

کمانے کے قابل ہو جائیں۔ خواہ انہیں کوئی سرکاری ملازمت ملے یا نہ ملے۔"

اسی طرح ۱۹۳۱ء کے اجلاس رہتک کے صدر اپنے خطبہ میں لکھتے ہیں:-

"ہندوستان میں ہماری حالت کے لحاظ سے ہمارا فرض ہے کہ ایسا سلسلۂ تعلیم تجویز کریں جو ہمارے نوجوانوں کو روٹی کمانے میں مدد دے۔"

وہ اپنا ذاتی مشاہدہ بیان کرتے ہیں کہ

"بہت سے نوجوان جو پبلک سروس کمیشن کی انتخاب کرنے والی کمیٹی کے سامنے بطور امیدوار ملازمت پیش ہوئے ان کے پاس ہندوستان اور ولایت کی یونیورسٹیوں کی بہت عمدہ اور اعلیٰ سندیں موجود تھیں مگر پھر بھی ان میں سے تقریباً ہر ایک شخص پچھتر روپیہ سے ایک سو روپیہ ماہوار تک کی نوکری خوشی سے قبول کر لیتا۔"

مگر میرا ذاتی تجربہ اس سے زیادہ دردناک ہے۔ میرے پاس ایک مسلمان ایم اے کی درخواست آئی کہ وہ صرف پندرہ روپیہ ماہوار اور خوراک پر ملازمت کے واسطے تیار ہیں۔

اس کے علاوہ گزشتہ چند سال میں مختلف یونیورسٹیوں کے تقسیم اسناد کے جلسوں میں جو خطبے دئے گئے ہیں تقریباً ان سب میں موجودہ تعلیم کے نقائص اور نوجوانوں کی بے روزگاری کا ذکر کر کے حکومت کو اس کی اصلاح پر متوجہ کیا گیا ہے،

حکومت کا فرض ہے کہ وہ اپنے فائدہ کے لئے ان مشوروں پر عمل کرے اور ماہرین کی مدد و رہنمائی سے ہندوستان کے موجودہ نظام تعلیم پر از سرِ نو غور کرکے ایسی تبدیلیاں عمل میں لائے جو بحالت موجودہ ہندوستان کے لئے مفید ہوں لیکن حکومت کی تعلیمی پالیسی ایک خاص حیثیت رکھتی ہے وہ کسی جماعت یا فرقہ کی مخصوص ضروریات کی پابند نہیں ہے اور نہ ہونا چاہئے۔ لہذا ہر ضرورت کے لئے حکومت کا دروازہ کھٹکھٹانا اور خود کچھ نہ کرنا نہ مفید ہے نہ مقتضائے غیرت۔ ہم پر بھی ملک و ملت کے کچھ فرائض ہیں اس لئے تا بحدّ امکان ہمیں بھی موجودہ تعلیم کے نقائص دور کرنے کے لئے جدوجہد کرنا چاہئے۔ یہ تعلیم تربیت کے ماتحت ہو اور شعائرِ اسلامی اور جذبات قومی و آیندہ زندگی کی خوش اسلوبی وسلیف ہیلپ کی عزت، غیرت، راست بازی اور ایمان داری کا ایک خوش نما گلدستہ ہونا چاہئے۔

زرعی تعلیم

حضرات اس مختصر خطبۂ صدارت میں کسی مفصل تعلیمی اسکیم کا پیش کرنا مشکل ہے اور شاید اس کی ضرورت بھی نہیں۔ اس لئے میں صرف اشارۃً چند امور پیش کروں گا۔ مثلاً میرا خیال ہے کہ اس وقت جب کہ ملازمت کا دروازہ تقریبًا بند ہو چکا ہے ہمارے نوجوانوں کو دوسرے ذرائع معاش پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ان ذرائع میں سے زراعت ایک معزز ترین ذریعۂ معاش ہے۔ ہندی مقولہ ہے کہ "اُتم کھیتی مدھم بنج۔ نشٹ چاکری بھیک ندان"

ابن یمین کہتا ہے ؎

اگر دو گاؤ بہم آوری و مزرعۂ — یکے امیر و یکے را وزیر نام کنی
ہزار بار فزوں تر نیرزد ابن یمین — کمر بندی و بر مرد کے سلام کنی

ہندوستان بحالت موجودہ ایک زرعی ملک ہے اور یہاں کی کثیر آبادی زراعت پیشہ ہے لیکن یہ کام ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو جاہل محض ہیں اور صدیوں سے ایک ہی طرز و انداز پر کام کرتے چلے آتے ہیں۔ یورپ نے اس کام میں بیحد ترقی کی ہے اور اس کو ایک مستقل و مفید فن بنا دیا ہے جس کی علمی و عملی حیثیت سے باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے۔ مختلف اجناس کے علاوہ پھلوں کے متعلق بھی مسلسل تجارب کئے گئے ہیں اور ان سب تجارب کا یہ نتیجہ ہے کہ اجناس اور پھلوں کی کمیت و کیفیت میں ترقی ہوئی ہے۔ زمین کی اصلاح اور درستی کی تدبیروں نے اس کو زیادہ بارآور زرخیز بنا دیا ہے اس کے علاوہ ایسی مشینیں اور آلات ایجاد کئے ہیں جن کے برتنے سے وقت و محنت کی بچت کے علاوہ بلحاظ نتائج مصارف میں بھی کفایت ہوتی ہے ہندوستان میں ابھی زمین کے ہزاروں قطعات یوں ہی بیکار پڑے ہیں۔ اگر ہمارے نوجوان محنت پر آمادہ ہوں تو وہ ان بنجر زمینوں کو گلزار بنا سکتے ہیں جو خود ان کے لئے اور ہندوستان کے لئے مفید ہوگا، وہ پھلوں کی حیثیت میں ترقی دے کر اور ان کو دیر تک محفوظ رکھنے کے طریقے سیکھ کر وسیع پیمانہ پر اُن کی تجارت

کر سکتے ہیں، غرض اس شعبہ میں ابھی بڑی گنجایش اور محنت پسند نوجوانوں کے لئے کام کا ایک وسیع میدان موجود ہے۔

اگر ہمارے نوجوان بمقتضائے ؎

ہمت بلند دار کہ پیشِ خدا و خلق
باشد بقدرِ ہمتِ تو اعتبارِ تو

عزم راسخ اور ہمت مردانہ سے کام لیں اور اپنی عملی قوتوں کو حرکت میں لائیں۔ تو ملازمت کے علاوہ وہ دوسرے ذرائع معاش سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ مثلاً حیوانات کی پرورش اور ان کی افزائش نسل، اور ان سے زیادہ متمتع ہونے کی تدبیریں جیسے کہ یورپ والے منجمد دودھ اور مکھن وغیرہ کی تجارت اور کاروبار سے فائدہ اٹھا رہے ہیں ان کاموں کے علاوہ ملک کے دوسرے قدرتی وسائل و ذرائع سے بھی تجارتی حیثیت سے کام لیتے ہیں غرض میدانِ عمل بہت وسیع ہے ؎

ہزار رخنہ بدام و مرا ز سادہ دلی
تمام عمر در اندیشۂ رہائی رفت

ہمارے اطراف میں مارواڑی لوگ جو باہر سے آکر پہلے لین دین کا کام شروع کرتے ہیں اس کے بعد روپیہ کما کر بڑی بڑی جاگیریں اور علاقے حاصل کر کے زمیندار بن جاتے ہیں۔ لیکن خود ہماری حالت یہ ہے کہ جن کے یہاں آبائی طور پر

زمینداری کا پیشہ چلا آتا ہے وہ بھی جب تعلیم حاصل کر لیتے ہیں تو ملازمت کے شوق میں دفتروں کی خاک چھانتے پھرتے ہیں اور ان کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ اپنے کام پر توجہ کرکے اس کو ترقی دیں۔ ان میں جو زیادہ حوصلہ مند ہوتے ہیں وہ قانون کی تعلیم پا کر وکالت کا پیشہ اختیار کرکے نسبتاً آزادانہ زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں خواہ وہ اس پیشہ میں ناکامیاب ثابت ہوں جو اور زیادہ بلند پرواز ہیں وہ بیرسٹری کی تعلیم کے لئے ولایت چلے جاتے ہیں اور اکثر اوقات اس اولوالعزمی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جائداد پر سودی قرضہ کا بار بڑھ جاتا ہے اور بیرسٹری بھی نہیں چلتی۔ غرض ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی یہ حالت ہے کہ لا الیٰ ھٰؤلاء ولا الیٰ ھٰؤلاء۔

ستم ظریفی تو یہ ہے کہ اگر زمینداری پیشہ طبقہ میں سے حسن اتفاق سے کچھ نوجوان زراعت کی تعلیم حاصل بھی کر لیتے ہیں جب بھی ملازمت کا جذبہ فنا نہیں ہوتا۔ اب ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ محکمۂ زراعت میں کوئی ملازمت حاصل کریں اور خود ان کے والد ماجد اگرچہ کچھ ذی اثر ہیں تو اپنے صاحبزادہ کی ملازمت کے لئے سفارشیں بہم پہونچاتے ہیں۔ غرض کسی کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ خود اپنے آبائی پیشہ کی طرف توجہ کرکے اپنا کام سنبھالے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے سامنے بھی اس کی مثالیں موجود ہوں گی کہ سادہ معاشرت رکھنے والے پرانی وضع کے اکثر زمینداروں نے اب تک

اپنی جائدادوں کو محفوظ رکھا ہے بلکہ بعض اوقات اس میں اضافہ کیا ہے لیکن جب تعلیم یافتہ نوجوان ان جائدادوں کے وارث ہوئے تو انھوں نے جدید طرز معاشرت کے لوازم اور فیشن پرستی پر یہ جائدادیں قربان کردیں اور بعض اوقات یہ جائدادیں ان کی تعلیم پر بامید موہوم قربان کردی گئیں۔

یہ حالات نہایت اندوہناک ہیں۔ میں نوجوانوں کو نصیحت کرتا ہوں اور ان کے والدین سے درخواست (بلکہ دست بستہ عرض) کرتا ہوں کہ وہ ان واقعات سے عبرت وبصیرت حاصل کرکے اپنے طریقہ کار پر غور کریں۔ گزشتہ پچاس برس میں ہزاروں زمینداریاں مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل چکیں جو اُن کے آباؤ اجداد نے دور اقتدار میں زمانہ دراز کی مسلسل محنت اور کفایت شعاری وسادہ معاشرت کی بدولت حاصل کی تھیں۔ جیسے جیسے یہ زمینیں مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلتی جاتی ہیں اس ملک میں ان کی اہمیت گھٹتی جاتی ہے اور پوزیشن کمزور ہوتی جاتی ہے۔ لہذا اس پر توجہ کیجئے۔ کم از کم اتنا تو کیجئے کہ جو کچھ آپ کے آباؤ اجداد نے چھوڑا تھا اس کو ضائع نہ کیجئے یاد رکھئے کہ واقعات کی رفتار یہ بتا رہی ہے کہ جو زمین ایک دفعہ آپکے ہاتھ سے نکل کر غیروں کے قبضہ میں چلی جائے گی وہ پھر کبھی آپ کے یا آپ کی اولاد کے پاس واپس نہیں آئے گی ۔ موجودہ طرز عمل سے آپ نہ صرف اپنی ذات کو نقصان پہونچا رہے ہیں بلکہ ہندوستان میں اپنی قوم کی اہمیت گھٹا رہے ہیں۔ بس اس سلسلہ

ہیں اس قدر گزارش کافی ہے۔"اگر در خانہ کس ست، حرفے بس ست"

صنعت و حرفت کی تعلیم

زرعی تعلیم کے بعد مسلمانوں کو صنعت و حرفت کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے جس پر تجارتی ترقی کا مدار ہے۔ صنعت و حرفت کی ضرورت یا اہمیت پر کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے ہر شخص جانتا ہے کہ آج یورپ، امریکہ اور جاپان کو جو برتری اور سیاسی اہمیت و قوت حاصل ہے وہ محض صنعت۔ تجارت اور حرفت کی بدولت ہے۔ یورپ کے چھوٹے چھوٹے ملک اپنی صنعتی اور تجارتی کاروبار سے کثیر دولت حاصل کر رہے ہیں اور ہندوستان باوجود اپنے وسیع ذرائع کے مفلس و محتاج ہے۔ بلکہ وہ اس ترقی پذیر زمانہ میں صنعتی حیثیت سے تنزل کر رہا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہندوستان کے دست کار تمام دنیا میں شہرت یافتہ تھے اور نادر المثال چیزیں تیار کرتے تھے۔ لیکن مختلف اسباب سے جن کا ذکر باعث طوالت ہے۔ یہاں کی دستکاری پر زوال آیا اور لاکھوں کاریگر بیکار ہو گئے۔ اور اُن کے لئے کوئی ذریعۂ معاش باقی نہ رہا۔ اور یہ یاد رکھئے کہ ان صنّاعوں اور کاریگروں میں مسلمانوں کا حصّہ کچھ کم نہ تھا۔ حبِّ وطن مقتضی ہے کہ ہم ان صنعتوں کو زندہ کریں اور اس کے علاوہ عہد جدید کے ایجادات سے بھی فائدہ اٹھائیں۔ یہ زمانہ مشینوں کا ہے اور اگر ہم صنعتی و تجارتی حیثیت سے ترقی کرنا چاہتے ہیں تو مشینوں سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ ہماری بھی عجیب ذہنیت ہے۔ ایک طرف تو ہم یہ شور برپا کرتے

ہیں کہ یورپ اور جاپان تجارت کے ذریعہ سے ہندوستان کی ساری دولت باہر کھینچ رہے ہیں، دوسری طرف یہ حالت ہے کہ ہم اپنے ملک میں ان مصنوعات کی تیاری پر توجہ نہیں کرتے اور اغیار کے دستِ کرم بلکہ درازدستی کے محتاج ہیں۔

حضرات! بحالتِ موجودہ آپ کے لئے دو ہی راستے ہیں یا تو تمام جدید مصنوعات کا استعمال (جو تمدن جدید کے لوازم ہیں) قطعاً ترک کر دیجئے اور اب سے دو سو برس پہلے کا تمدن اختیار کیجئے، جب کہ ان مصنوعات کا وجود نہ تھا، لیکن اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے (اور یقیناً ایسا نہیں کر سکیں گے) تو جدید آلات اور مشینری سے فائدہ اُٹھا کر یہ مصنوعات اپنے ملک میں تیار کیجئے۔ یاد رکھئے کہ ہر تجارتی کاروبار کی ترقی اس کی "مانگ" یا "طلب" پر ہے۔ جب تک آپ کے ملک میں ان مصنوعات کی "طلب" ہے یہ چیزیں برابر باہر سے آتی رہیں گی اگر آپ چاہتے ہیں کہ باہر سے نہ آئیں تو اپنے ملک میں تیار کر کے ضروتمندوں کے لئے مہیّا کیجئے۔ جو ملک اپنی ضروریات زندگی بھی خود بہم نہیں پہنچا سکتا۔ اس سے زیادہ بدقسمت و محتاج اور کون سا ملک ہو سکتا ہے۔ میں نے صنعت و حرفت کا ذکر اسی موقع پر بہ سلسلہ تعلیم کیا ہے کیوں کہ صنعتی تعلیم بجائے خود ایک مستقل شعبہ تعلیمات کا ہے اور مسلمانوں کو اس پر توجہ کرنے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ صنعتی تعلیم کے متعلق میں نے اپنے خیالات اختصار سے عرض کئے ہیں۔ کانفرنس نے مسلمانوں کی اقتصادی حالت اور

ان کا افلاس دور کرنے کی تدابیر کے متعلق ایک مفصل رپورٹ گزشتہ سال کے ایک رزولیوشن کی تعمیل کے سلسلہ میں تیار کی ہے۔ کانفرنس گزٹ میں اس رپورٹ کے مضامین کا اجمالی تذکرہ آچکا ہے۔ یہ رپورٹ اس اجلاس میں پیش ہوگی اور اس پر مباحثہ ہوگا۔ لہذا جو حضرات ان مسائل سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ اس رپورٹ کے پیش ہونے کا انتظار فرمائیں

ابتدائی و ثانوی تعلیم

حضرات! زرعی و صنعتی تعلیم کے علاوہ ہمیں جس تعلیم پر سب سے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے وہ ابتدائی و ثانوی تعلیم ہے، اگر کسی ملک میں کچھ لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں اور عام افراد بدستور جہالت و پستی کی حالت میں رہیں تو وہ ملک ترقی نہیں کرسکتا۔ نہ مہذب و تعلیم یافتہ کہا جاسکتا ہے۔

ہندوستان میں ابھی تک شہری آبادی کا بڑا حصّہ بھی ناخواندہ ہے دیہات کی حالت تو اور بھی ابتر ہے۔ اور تعلیمی ترقی کی جو رفتار ہے اس کے لحاظ سے ابھی ہندوستان کی پوری آبادی کو خواندہ ہونے کے لئے کئی صدی کی مدّت درکار ہے لہذا ہمیں اس حالت پر مطمئن نہ ہونا چاہئیے۔ بلکہ ہر صوبہ اور ہر ضلع میں پوری قوت سے یہ کوشش کرنا چاہئیے کہ دس برس کے اندر پوری آبادی کو خواندہ بنادیں۔ مستقبل قریب میں ہندوستان کے انتظام حکومت میں جو تبدیلیاں ہونے والی ہیں وہ اسی قوم کے لئے زیادہ

مفید ثابت ہوں گی جس کے زیادہ افراد خواندہ ہوں گے۔ روس کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ اس نے ایک خاص اسکیم کے ماتحت بڑی زبردست کوشش کر کے صرف چند سال میں تقریبًا تمام آبادی کو خواندہ بنا دیا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ہمیں ثانوی تعلیم پر توجہ کرنا چاہیئے اور اس کے طلبہ کو حسب مناسبت طبع صنعت و حرفت یا زراعت و انجنیری و ڈاکٹری وغیرہ کامیاب شعبوں میں بھیجنا چاہیئے تاکہ تعلیم کے بعد وہ دریوزہ گری نہ کریں اور کسب معاش کے لئے انھیں زیادہ مصائب و مشکلات کا سامنا نہ ہو۔

اعلیٰ تعلیم

اعلیٰ تعلیم کے مختلف پہلوؤں کے متعلق سرسید کے زمانہ سے اب تک بہت کچھ کہا گیا ہے۔ اب ان خیالات کا اعادہ کرنا تحصیل حاصل ہے۔ مسلمانوں کی تعلیم جن اغراض کے ماتحت شروع کی گئی تھی اور اس کے جو نتائج نکلے وہ ہمارے سامنے ہیں۔ ان حالات کے لحاظ سے میری رائے ہے کہ اعلیٰ تعلیم صرف ان لوگوں کو حاصل کرنا چاہیئے جو اس کی کافی استطاعت رکھتے ہیں اور فکر معاش سے ایک حد تک آزاد ہیں۔ اس کے علاوہ اعلیٰ تعلیم کے لئے وہ طلبہ موزوں ہیں جو اپنی جسمانی صحت اور طاقت و توانائی کے لحاظ سے بہتر حالت میں ہیں، اور دماغی و ذہنی حیثیت سے بھی ممتاز ہیں، اور ابتدائی و ثانوی تعلیم کے مدارج نمایاں قابلیت و امتیاز کے ساتھ طے کر چکے ہیں۔ لیکن جو طلبہ ایسے نہیں ہیں اُن کو اعلیٰ تعلیم پر مجبور کرنا

خود اُن پر اور قوم کے سرمایہ پر ظلم ہے، اور نتیجہ کے لحاظ سے محض بے سود۔ اگر اس قسم کے لوگ مرکھپ کر تھرڈ ڈویژن میں کامیاب بھی ہو جائیں۔ تب بھی بازار میں اُن کی کوئی قیمت نہیں جب کہ اُن سے زیادہ لائق لوگ بیکار بیٹھے ہیں۔
ہمارے یہاں یہ عجیب مصیبت ہے کہ طالب علم کی مناسبت طبع کا لحاظ کئے بغیر اس کو کسی خاص شعبہ کی تعلیم کے لئے بھیج دیا جاتا ہے مثلاً ایک پیشۂ قانون ہی کو لیجئے۔ اکثر مربیوں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اپنے بیٹے کو وکیل بنائیں۔ حالاں کہ اس کو نہ تو قانون سے مناسبت ہے نہ زبان میں قوّتِ گویائی اور نہ اس میں وہ خاص قسم کی ذہانت ہے جس کی ایک وکیل کو ضرورت ہے نتیجہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ ایسے طلبہ امتحانات میں بار بار ناکامیاب ہوتے ہیں اور اگر کبھی کتابیں رٹ کر کامیاب بھی ہو گئے تو عملی دنیا میں آنے کے بعد مایوسی کا سامنا ہوتا ہے وکالت نہیں چلتی اور وہ بھی دوسرے نوجوانوں کی طرح ملازمت کی تلاش پر مجبور ہوتے ہیں اور اکثر اوقات چھوٹی ملازمت پر قانع ہو جاتے ہیں اور اگر ملازمت بھی نہ ملی تو ”ازیں سو راندہ و ازاں سو درماندہ“ کے مصداق بن جاتے ہیں کاش وہ خود یا اُن کے والدین پہلے سے یہ اندازہ کر لیتے کہ قانون کی تعلیم کے لئے موزوں نہیں ہیں تو نہ مصیبت اُٹھانی پڑتی نہ تضیع اوقات کر کے ”نقصانِ مایہ و شماتتِ ہمسایہ“ کی مثل ثابت آتی۔
غرض ہر شخص اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے نہیں پیدا کیا گیا، نہ ہر شخص کا دماغ

ہر تعلیمی شعبہ کے لئے موزوں ہے۔ جو شخص جس کام کے لئے نہیں پیدا کیا گیا ہے اس کام کے لئے مجبور کرنا وضع الشئی فی غیر محلہ ہے۔ اگر پہلے سے اس کا لحاظ رکھا جائے تو بہت سے مصائب جو بعد کو پیش آتے ہیں اُن سے نجات مل جائے۔

فیلوشپ ہندوستان میں نصف صدی سے زیادہ زمانہ گزرا کہ مسلمان علوم جدیدہ کے حاصل کرنے میں مصروف ہیں اور تقریباً اسی قدر مدت سے علم کا اعلیٰ مقصد اور بلند مطمح نظران کے سامنے پیش کیا جاتا ہے لیکن باوجود اس کے ہماری قوم میں ابھی تک کوئی ایسی جماعت نہیں پیدا ہوئی جس نے علمی فضیلت کے لحاظ سے کوئی بین الاقوامی شہرت حاصل کی ہو۔ حالاں کہ برادرانِ وطن میں ایسے متعدد فضلاء موجود ہیں جو علم کے مختلف شعبوں میں نمایاں شہرت و امتیاز حاصل کر چکے ہیں۔

علاوہ اور وجوہ کے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو عموماً فارغ البالی میسر نہیں۔ بہت سے طلباء جو زمانۂ تعلیم میں کسی خاص فن مثلاً ریاضی یا سائنس وغیرہ میں ممتاز ہوتے ہیں، جب تعلیم حاصل کرنے کے بعد ملازمت یا کسی اور پیشہ میں مصروف ہو جاتے ہیں اور خانگی افکار انھیں گھیر لیتے ہیں تو پھر کسی علم وفن سے انھیں مناسبت نہیں رہتی۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ کبھی علم سے آشنا ہی نہ تھے۔ درحقیقت یہ امر لائقِ افسوس ہے کہ پچاس برس کی مسلسل تعلیم کے بعد بھی ہم میں کوئی ایسی جماعت نہ پیدا ہو سکی جس کا نصب العین صرف علم ہو اور وہ

خاص علمی خدمت میں مصروف رہے۔

اس حالت کی ایک حد تک اس طرح اصلاح ہو سکتی ہے کہ فیلوشپ کا طریقہ جاری کیا جائے جس کی ضرورت بار بار تسلیم کی گئی۔ مگر عمل ہیچ۔ بہرحال ہونا یہ چاہیئے کہ جو طلبا کسی خاص فن سے مناسبت و ذوق رکھتے ہوں جب وہ اپنی تعلیم مکمل کریں تو انھیں معقول وظیفہ دیا جائے تاکہ وہ اطمینان خاطر کے ساتھ دو تین سال تک اس فن کے مطالعہ و تحقیقات میں مصروف ہو کر خاص قابلیت و نمایاں امتیاز حاصل کریں اور اس کے بعد تالیف و تصنیف یا درس و تدریس کے ذریعہ سے اپنے مخصوص فن سے طلبا و ارباب علم اور اپنی قوم کو فائدہ پہونچائیں۔ جب تک یہ نہ ہوگا مشکل ہے کہ ہماری قوم میں نامور فاضل پیدا ہوں۔

تعلیم نسواں عورتوں کی تعلیم مذہبی یا اخلاقی حیثیت سے کوئی مختلف فیہ مسئلہ نہیں ہے۔ اسلام نے مردوں اور عورتوں کو یکساں تحصیل علم کا حکم دیا ہے اور ابتدا سے مسلمانوں کا اس پر عمل بھی رہا ہے ہر شخص جانتا ہے کہ ایک خواندہ یا صحیح طریقہ سے تعلیم یافتہ عورت نہ صرف اپنے بچوں کی ہی عمدہ طریقہ سے تربیت کر سکتی ہے بلکہ اس کا وجود گھر کے لئے بھی ایک رحمت ہے اور شوہر کے لئے باعث سکونِ قلب، فراغت و سرچشمۂ راحت ہے۔

غرض محض تعلیم نسواں سے کسی کو اختلاف نہ ہونا چاہیئے۔ بحث جو کچھ ہے

وہ یہ ہے کہ تعلیم کیسی ہو اور کس حد تک ہو۔ اگر عورتوں اور مردوں کے فرائضِ حیات اور زندگی کی ضرورتیں بالکل یکساں ہیں اور ان میں کوئی فرق نہیں تو پھر تعلیم میں اختلاف کی کوئی وجہ نہیں۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو پھر ہم کو عورتوں کے لئے مخصوص تعلیم کا انتظام کرنا پڑے گا جو فطری حیثیت سے اُن کے فرائضِ حیات کے مناسب ہو۔ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو غلط راستہ اختیار کریں گے جس کے نتائج جیسے ہوں گے ظاہر ہے۔

موجودہ عہد میں ہماری موجودہ نسل کے اہل الرائے حضرات نے اپنے ذہنوں میں عورتوں کے کیا فرائض قرار دے رکھے ہیں؟ یہ مضمون المعنیٰ فی بطن الشاعر کا ہے۔ البتہ یہ واقعہ ہے کہ زمانۂ دراز سے اب تک مسلسل ہر ملک میں غلط یا صحیح طور پر عورتوں کے یہ فرائض سمجھے گئے ہیں کہ وہ بچّوں کی پرورش و نگہداشت و تعلیم و تربیت کے علاوہ خانگی زندگی میں مردوں کی مدد کریں یعنی گھر کا جو چھوٹے سے پیمانہ پر ایک سلطنت ہی اس طریقہ سے انتظام کریں کہ مرد گھر کے اندرونی جھگڑوں اور جنجال سے آزاد ہو کر اپنے بیرونی فرائض اطمینانِ خاطر سے انجام دے سکیں، اور جب وہ اپنے پُر مشقت فرائض ادا کرنے کے بعد گھر میں آئیں تو خانگی زندگی کا لطف اور سچّی راحت حاصل کر سکیں۔ گویا ایک بی بی کو گھر کی مالکہ بلکہ ملکہ ہونا چاہئے نہ کہ مردوں کے مخصوص فرائض و مشاغل میں ناواجب و غیر ضروری مداخلت کرنے والی

مردوں کے فرائض غیر متناہی تھے۔ مثلاً ایک باضابطہ حکومت کا قائم کرنا، قلعوں اور عمارتوں کی تعمیر، اسلحہ کی تیاری، مخالفینِ حکومت سے جنگ سڑکوں کا بنانا، پہاڑوں کا کاٹنا، جنگلوں کا صاف کرنا، سمندروں میں جہازرانی تالیف وتصنیف وغیرہ وغیرہ۔ یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے کام مردوں کے فرائض میں داخل تھے۔ اب اگر ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو فرائض کی یہ پرانی تقسیم پسند نہیں اور وہ اس میں تبدیلی کرنا چاہتے ہیں تو ؎

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند
گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

لیکن یہ یاد رکھئے کہ جب تک دنیا میں ازدواجی تعلقات جاری ہیں اور توالد و تناسل کا سلسلہ باقی ہے، خانگی انتظام کی ضرورت ناگزیر ہے خواہ یہ انتظام بدستور عورتوں کے ہاتھ میں ہو یا مرد یہ خدمت انجام دیں لیکن فرقہ اُناث کی خاص خصوصیات بہرحال علیٰ حالہا باقی رہیں گی اور ان کے واسطے خاص تعلیم کی ضرورت بھی ہمیشہ باقی رہے گی۔ میرے نزدیک تعلیم کا صحیح مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں میں فرائض کا احساس پیدا کرکے اُن کے خوش اسلوبی سے انجام دینے کے لئے رہنمائی کرے۔ لہذا اب یہ آپ کا کام ہے کہ آپ کے نزدیک عورتوں کے جو کچھ بھی فرائض آپ نے قرار دے لئے ہوں اُن کے مطابق ان کا نصابِ تعلیم مرتب کیجئے۔

پردہ مانع تعلیم نہیں ہے نیز یہ بحث بھی واجب ہے کہ پردہ کس قسم کا ہونا چاہئے۔ اور اس کو مقررہ مذہبی پردہ سے بھی زیادہ تنگ یا اس سے زیادہ وسیع ہونا چاہئے یا کیا؟ اس لئے تعلیم کی بحث میں پردہ کا ذکر چھیڑنا آج کل خطرناک جرأت ہے۔ اور میں چوں کہ اپنی مخدرات عصمت مآبات کے مخصوص فرائض و ضروریات کے لحاظ سے ایسی تعلیم گاہوں کا حامی ہوں جو عورتوں کے لئے مخصوص ہوں اس لئے تعلیمی سلسلہ میں پردہ کی بحث پیدا نہیں ہوتی اور میں ایک خالص مذہبی بحث کو اس خالص تعلیمی انجمن میں چھیڑنا بھی پسند نہیں کرتا۔ البتہ صرف اس قدر عرض کروں گا کہ اسلامی تعلیمات کی نمایاں خصوصیت اس کا اعتدال ہے۔ اس بنا پر اسلام نہ تو عورتوں کو چار دیواری کے اندر ہر وقت قید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے اور نہ عام مردوں کے ساتھ ان کا بے محابا اختلاط جائز رکھتا ہے۔ میرا مسلک تو یہ ہے کہ اگر بے پردگی ہو تب بھی پردے کا لحاظ رہے۔ اور پردہ ہو تو وہ بھی قید سخت نہ ہونا چاہئے۔ بہر حال ؎

من نگویم کہ ایں مکن آں کن
مصلحت بین و کار آساں کن

تعلیمی زبان کا مسئلہ

حضرات! چند سال سے ماہرین تعلیم ہندوستان کے نظام تعلیم پر مسلسل نکتہ چینی کر رہے ہیں اور اس میں

تبدیلی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ بے شک نقائص موجود ہیں اور ان کی اصلاح ضروری ہے، لیکن میں یہاں صرف ایک بنیادی نقص کا ذکر کروں گا جو بہت سی مشکلات کا باعث ہے اور جس پر سب سے پہلے توجہ کی ضرورت ہے۔ وہ بنیادی نقص یہ ہے کہ یہاں تمام علوم کی تعلیم ایک غیر ملکی زبان کے ذریعہ سے دی جاتی ہے جس نے ہمارے دماغ پر غیر معمولی بار ڈالا ہے، اور ہماری تعلیم میں غیر ضروری دشواریاں پیدا کر دی ہیں۔ غالباً تمام دنیا میں یہ خصوصیت صرف ہندوستان کی ہے کہ یہاں ملکی زبانوں کو ثانوی حیثیت دی گئی ہے، اور ایک اجنبی زبان کو تحصیل علم کا مخصوص ذریعہ بنایا گیا ہے۔ عام علوم کسی خاص زبان کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں اگر ایسا ہوتا تو یورپ کے مختلف ممالک میں یہ علوم مختلف زبانوں میں نہ پڑھائے جاتے۔

ملکی زبانوں کے متعلق ہمیشہ یہ کہا گیا کہ ان میں علمی و تعلیمی زبان کی صلاحیت نہیں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ زبان میں یہ صلاحیت کس طرح پیدا ہوتی ہے؟ آج جو زبانیں علمی سمجھی جاتی ہیں وہ بھی تدریجاً اس مرتبہ پر پہونچی ہیں اور ان کے ذخیرۂ الفاظ و مصطلحات میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوا ہے۔ اگر انھیں علمی زبان بنانے کا

قصد نہ کیا جاتا تو آج بھی ان میں یہ صلاحیت پیدا نہ ہوتی۔

مقامِ مسرت ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے قیام و کامیاب تجربہ نے ان تمام اوہامِ باطلہ کا خاتمہ کر دیا ہے اور آج یہ تخیل ایک واقعہ کی صورت میں سامنے ہے کہ جامعہ عثمانیہ میں جملہ علوم کی تعلیم اُردو زبان میں دی جاتی ہے اور جامعہ کے طَلَبا، اپنی علمی قابلیت کے لحاظ سے کسی دوسری یونیورسٹی کے طلبا سے کم نہیں ہیں۔

سنہ ۱۹۱۷ء میں سر محمدؐ اکبر حیدری (نواب حیدر نواز جنگ) نے کلکتہ میں اجلاس کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے اُردو میں علوم کی تعلیم کو ایک "نیا اور نادر تجربہ" بتایا تھا۔ بے شبہ اُس وقت یہ نیا تجربہ تھا۔ لیکن اب سنہ ۱۹۳۴ء میں دولت آصفیہ کے ایک اعلیٰ عہدہ دار نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ گویا اس تجربہ کے کامیاب ہونے کا اعلان ہے۔

یعنی گزشتہ فروری سنہ ۱۹۳۴ء میں جامعہ عثمانیہ کا جلسۂ تقسیم اسناد تھا جس میں نواب مہدی یار جنگ صدر المہام سیاسیات نے اپنے خطبہ میں بیان کیا ہے:

"اساتذہ نے ہمت شکن ماحول میں بڑی ذہانت
اور قابلیت سے ثابت کر دکھایا کہ ہندوستانی
زبان کس آسانی سے جدید ضروریات کو کافی
ہو سکتی ہے اور اس میں مطلب ادا کرنے کی کیسی استعداد
موجود ہے۔"

پھر مختلف شعبوں میں یونیورسٹی کی کامیاب حیثیت ظاہر کرنے
کے بعد کہا ہے:

"حاصل کلام یہ کہ گو ناگوں علوم و فنون میں
ہندوستانی زبان سے خواہ کیسا ہی سخت کام
لیا گیا ہو وہ ہر ایک موقع پر ہر ضرورت کو
کافی ثابت ہوئی۔ اس تجربہ نے نوجوانانِ ملک
میں خود اعتمادی کی ایک تازہ لہر دوڑا دی۔ اور
اُس زبان پر فخر و اعتماد پیدا کر دیا جو اپنی
زبان ہے۔"

غرض جامعہ عثمانیہ کے تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ اُردو بخوبی
ذریعۂ تعلیم بن سکتی ہے۔ لیکن سلطنت حیدرآباد کی مثال
سلطنت برطانیہ کے قلمرو میں پیش کرنا قیاس مع الفارق ہے

وہاں خود سلطنت ان دیسی زبانوں میں تعلیم کی حامی اور سرپرست اور ضامن ہے۔ یہاں برٹش گورنمنٹ سوائے انگریزی کے کسی خاص دیسی زبان کی تعلیم دینے کی نہ حمایت کر سکتی ہے نہ ضمانت۔ لیکن اب ہندو یونیورسٹی نے ہندی کے متعلق یہ تجربہ شروع کر دیا ہے کہ متعدد علوم اب ہندی میں پڑھائے جائیں گے۔ اس تجربہ کی کامیابی کا انتظار کرنا چاہئے۔ اور بصورت کامیابی سے

دریں دریائے بے پایاں دریں طوفانِ موج افزا
دل افگندیم بسم اللہ مجریھا و مرسٰھا

کہہ کر دریائے عمل میں کود پڑنا چاہئے۔

اگر اس تجربہ میں کامیابی ہوئی تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کامیاب تجربہ کے بعد ہندوستان کی دیگر یونیورسٹیوں میں کیوں نہ ملکی زبانوں میں تعلیم دی جائے۔ ایسی حالت میں کم از کم ہماری مسلم یونیورسٹی میں ہندوستانی زبانوں میں تعلیم دی جائے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ایسا کیا گیا تو تعلیم وسعت اختیار کرے گی اور تمام ملک اس تبدیلی کا خیر مقدم کرے گا۔

تربیت اور اصلاحِ سیرت

حضرات! میرا پختہ و مستحکم خیال ہے کہ ہر وہ تعلیم جس کے ساتھ صحیح تربیت نہ ہو اور جو انسان کی سیرت و خصلت کی صحیح طریقہ سے تعمیر و اصلاح نہ کرے ایک ناکامیاب تعلیم ہے۔ ایک عامی اور ایک تعلیم یافتہ شخص کے عادات و اطوار اور افکار و اعمال میں ضرور بیّن فرق ہونا چاہیئے۔ تربیت سوسائٹی کے چند ظاہری رسوم و قواعد کا نام نہیں جو محض نمائشی چیز ہے۔

تربیت کا معیار اس سے بہت زیادہ بلند ہے۔ تربیت کا مسئلہ تعلیم سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور انسان کی آئندہ ترقی و فلاح کے مسئلہ پر تعلیم سے زیادہ مؤثر ہے لیکن بخوفِ طوالت تفصیل سے اجتناب کیا جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ کامیاب تربیت وہ ہے جو انسان کی روح میں نفوذ کرکے اُس میں خوشگوار تبدیلی پیدا کرے۔ اور زندگی کو ایک خاص سانچہ میں ڈھال دے۔

قوموں کی ترقی کا راز عمدہ سیرت اور پختہ کیرکٹر میں مخفی ہے۔ کسی زمانہ میں مسلمانوں کو جو عروج و اقتدار حاصل تھا اُس کا سبب صرف یہی نہیں تھا کہ وہ علوم و فنون کے ماہر اور مالک تھے اور اُن کو سلطنت و حکومت حاصل تھی بلکہ خود سلطنت کا حاصل ہونا نتیجہ تھا اُن کے زبردست کیرکٹر کا جس نے اُن میں عزم، حوصلہ، بلند نظری اور استقامت پیدا کردی تھی اور یہ نتیجہ تھا ایک زبردست

روحانی معلم اور احناف لاءکی تعلیم و تربیت کا۔ جب تک یہ اوصاف اُن میں موجود رہے برابر عروج ہوتا رہا لیکن جب اُن میں اخلاقی کمزوریاں پیدا ہوگئیں جو نتیجہ ہیں اُن کے اُس معلّم کامل کی تعلیم سے بے پروائی کا، تو سلطنت کا صرف ڈھانچہ رہ گیا۔ بادِ مخالف کا ایک جھونکا آیا اور اُس کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

کیرکٹر یا سیرت کے مختلف پہلو ہیں۔ سب پر بحث ممکن نہیں۔ اشارۃً بعض چیزیں عرض کی جاتی ہیں:

مثلاً۔ انسان کی ایک خوبی یہ ہے کہ اُس میں استقامت و استقلال ہو اور معمولی حوادث یا خارجی اثرات اُس کے عزم کو جنبش نہ دیں، وہ دوسروں کی کورانہ تقلید نہ کرے۔ بلکہ ہر چیز کی اصلی حقیقت تک پہنچکر خود رائے قائم کرے۔ لیکن کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے یہاں اس قسم کی تربیت دی جاتی ہے اگر ایسا ہوتا تو ہم یورپ کی کورانہ تقلید کرکے اپنی مستقل ہستی اور قومیت کی بربادی کا سامان جمع نہ کرتے۔ ہاں ہم نے انگریزی پڑھی اچھا کیا! لیکن اس کا یہ نتیجہ تو نہ ہونا چاہیئے تھا کہ اپنی اسلامی تعلیم، تہذیب، تاریخ، روایات اور عقائد سے یک قلم بیگانہ ہوجائیں۔ اگر ہم دوسروں میں جذب ہوگئے تو ہماری شخصیت و ہستی گویا فنا ہوگئی۔ یہ ترقی نہیں تنزل ہے۔ عروج نہیں زوال ہے۔ اُس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ دودھ میں اگر شکر ملا دی جائے تو دودھ تو ضرور میٹھا ہوجائے گا لیکن شکر صاحب کا وجود غائب۔

مجھے افسوس ہے کہ موجودہ تعلیم نے ہمارے نوجوانوں میں اخلاقی کمزوریاں پیدا کر دی ہیں۔ اُن کے قدم ڈگمگا گئے ہیں اور وہ اپنا لنگر قائم نہیں رکھ سکے۔ کاش وہ ثابت قدم رہتے اور دنیا پر یہ ظاہر کر دیتے کہ ایک مسلمان کے قدم کو کسی حالت میں لغزش نہیں ہوتی۔ مسلمان اگر مسلمان رہ کر ترقی کریں تو بے شبہہ خوشی کی بات ہے ورنہ یہ ترقی مسلمانوں کی نہیں کسی اور قوم کی ہوگی۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں یورپ کی تعلیم و تربیت و تہذیب یا معاشرت کی تنقیص کرتا ہوں۔ بلکہ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ یورپ کی سرد و یخ بستہ ہوا اور موسم میں آتش خانوں اور گرم مکانوں کی ضرورت ہوتی ہے وہاں کے کمروں کی تعریف میں ایک عام لفظ نائس اینڈ وارم (nice and warm) استعمال ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں بجائے آتش خانے کے خس خانے اور پنکھوں کی ضرورت ہوتی ہے اور مکانوں کی بابت کہتے ہیں کہ سرد اور خوشگوار۔ لہذا ہر ملک و ہر موسم کے زبردست اصول کا لحاظ لازم اور واجب ہے۔

دنیا کی ہر قوم جس میں ذرا بھی قومی عصبیت و حمیت ہے اپنی زبان، تاریخ، قومی روایات، علوم، تہذیب و تمدن اور آداب معاشرت کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتی ہے یورپ کا بھی آج اسی پر عمل ہے۔ مثلاً ایک انگریز مشرق میں بھی انگریز ہے۔ مغرب میں بھی انگریز ہے۔ جنوب میں بھی انگریز ہے

شمال میں بھی انگریز ہے۔ بحرِ منجمد میں بھی اُس کی وہی انگریزیت، انگریزی لباس، انگریزی خواص و عادات قائم رہتے ہیں اور افریقہ کی گرم اور تپتی ہوئی زمین پر بھی اُس کا وہی انگریزی کیرکٹر قائم رہتا ہے۔ دریا کی روانی میں، خشکی کے سفر میں اور اب تسخیر ہوا یعنی آسمانی سفر میں بھی اُس کا وہی کوٹ پتلون ہے جو اُس کے وطن میں تھا۔ اس کا قومی ترانہ ہوم سویٹ ہوم (Home sweet home) ہے اور اپنی پرائیوٹ گفتگو میں جب اپنے ملک کا ذکر کرتا ہے تو کس محبت اور شیریں لہجہ میں وہ اُس کو ہوم (Home) کہکر یاد کرتا ہے۔ بد قسمتی سے ہماری نظیر تقریباً اس کے بالکل برعکس ہے یعنی گویا کہ ہم اپنی وطنیت کے اظہار اور اس کے شعار سے شرمندہ ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مسلمانوں کا ماضی ایسا شاندار رہا ہے اور اُن کے اسلاف نے تمام دنیا میں ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں کہ اسلام کی تاریخ دنیا کی تاریخ کا عظیم الشان حصہ ہے اور دنیا کی ہر قوم اس تاریخ کا مطالعہ و تحقیقات ضروری سمجھتی ہے۔ یورپ میں سیکڑوں پروفیسر اسلامی تاریخ و علوم کی تحقیقات میں مصروف ہیں اور عربی فارسی کی بہت سی نادر الوجود کتابیں جو مختلف اسلامی علوم اور مذہب کے متعلق ہیں بڑی تلاش و جستجو کے بعد حاصل کر کے شائع کر چکے ہیں۔ غرض اسلامی لٹریچر کو آج بھی اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے فضلاء جو بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں اُس کی خدمت میں مصروف

ہیں، لیکن وائے برحالِ ما کہ ہم اپنی تاریخ و قومی روایات سے بے نیاز ہیں اور یہاں تک بے خبر ہیں کہ یہ بھی نہیں جانتے کہ اسلامی علوم کے متعلق یورپ میں کیا ہو رہا ہے ع

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

اپنی ہر چیز ہماری نگاہ میں ہیچ و حقیر ہے۔ یہاں تک کہ ہم اپنی زبان میں باہم لکھنا پڑھنا اور گفتگو کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔ لیکن جس قوم کی تقلید میں ہم نے اپنا سب کچھ برباد کیا ہے (جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں) اُس کی قومی حمیت کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے وطن سے ہزاروں میل کے فاصلہ پر جا کر بھی اپنی زبان، تہذیب اور سوسائٹی کے رسم و رواج کو چھوڑنا پسند نہیں کرتی۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ اخلاقی کمزوریاں یعنی قومی حمیت کا فقدان ہماری قومی تعلیم اور تربیت کی خامی کا نتیجہ ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں ہمیں صرف کتابیں پڑھا دی جاتی ہیں اور وہ بھی صرف اس لئے کہ امتحان پاس کر لیں اور پھر جو کچھ پڑھا ہے اُسے بھول جائیں ہماری دماغی ترقی یا اصلاحِ سیرت پر کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔

جدید طریقۂ تعلیم نے "استاد" کی اہمیت زائل کر دی ہے اس لئے تربیت کے مواقع بھی باقی نہیں رہے۔ اُستاد کی موجودہ پوزیشن یہ ہے کہ وہ اسکول یا کالج کا ایک تنخواہ دار ملازم ہے گویا خود اُستاد یا شاگرد کے باہمی

کوئی روحانی تعلق یا رشتہ نہیں ہے۔ اب طالب علم کی نسبت کسی استاد کی طرف نہیں کی جاتی بلکہ یہ معلوم کرنا کافی سمجھا جاتا ہے کہ اس نے کس کالج میں پڑھا۔ اس سے کچھ بحث نہیں کہ کس نے پڑھایا اور کیسا پڑھایا اور وہ پڑھانے والا کون اور کیسا تھا۔

برخلاف اس کے ہمارے مشرقی طریقۂ تعلیم میں استاد کی خاص حیثیت تھی وہ نہ صرف شاگرد کو علوم کی تعلیم دیتا تھا بلکہ اس کی حیثیت روحانی معلّم کی بھی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ اس کی دماغی و ذہنی تربیت بھی کرتا تھا۔ سیرت کی تشکیل و تعمیر بھی اس کے فرائض میں داخل تھی۔ غرض وہ ایک طویل زمانہ کی تعلیم و تربیت اور اپنے فیضانِ صحبت سے طالب علم کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دیتا تھا۔ یہ طلبا ہمیشہ اپنے استاد کی طرف منسوب ہوتے تھے اور ان کا یہ انتساب صحیح تھا۔ کیوں کہ وہ مخصوص علوم کے ذوق نیز سیرت کے لحاظ سے اپنے استاد کا صحیح نمونہ ہوتے تھے۔ چنانچہ جب کسی طالب علم کے متعلق معلوم ہوتا تھا کہ وہ فلاں امام یا استاد کا شاگرد ہے تو ہر شخص رائے قائم کر لیتا تھا کہ وہ اپنے ذوق و عقائد و خیالات اور سیرت و خصلت کے لحاظ سے کیسا ہوگا اور یہ رائے عموماً صحیح ہوتی تھی۔ غرض کہ یہ استاد طالب علم کا صرف استاد ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ پیر و مرشد بلکہ باپ اور اس سے بھی زیادہ ہوتا تھا۔ شاگردوں کے ساتھ اس کو والدین کی سی محبت اور شاگردوں کو اس کے ساتھ پیر و مرشد کی سی ارادت

ہوتی تھی۔

جب تک یہ پرانا طریقہ باقی رہا طلباء صحیح طور پر تربیت حاصل کرتے رہے اب طلباء کے دل میں نہ استاد کی عظمت اور اہمیت ہے اور نہ استاد کلاس کے اندر سطحی تعلیم اور معمولی لکچر دینے کے سوائے اپنا یہ فرض سمجھتا ہے کہ طلباء میں کوئی کیرکٹر پیدا کرے۔ نیز طلبہ کو علاوہ تعلیمی اوقات کے استادوں کی صحبت سے متمتع ہونے کا بھی موقع نہیں ملتا۔ جب تک یہ حالات موجود ہیں اس کی اُمید نہیں کہ ہمارے نوجوان صحیح تربیت حاصل کر سکیں حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے پورا انتظامِ تعلیم نظرثانی اور سخت نظرثانی کا محتاج ہے اور جب تک اُس میں اہم تبدیلیاں نہ ہوں کسی اصلاح کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

حضرات! اس سلسلہ میں بہت سی چیزیں کہنے کے لائق ہیں بات سے بات نکلتی آتی ہے۔ ع

شب آخر گشت و افسانہ از افسانہ می خیزد

مگر کہاں تک کہا جائے تاہم ایک چیز کے متعلق میں ضرور کچھ عرض کروں گا جو تربیت کی ایک ایسی خامی ہے جس کا اثر ہماری قومی زندگی پہ پڑ رہا ہے۔ اور وہ تعلیم کے خوشگوار اور مفید نتائج اور اثرات کو بھی برباد کر رہا ہے۔ اس سے میری مراد تعلیم یافتہ نوجوانوں کا اسراف ہے جو زیادہ تر مغربی معاشرت اختیار کرنے کا نتیجہ ہے۔ اول تو موجودہ زمانہ میں تعلیم اس قدر گراں ہے

کہ والدین اپنا پیٹ کاٹ کر اور مصیبت اٹھا کر اُن کی تعلیم کا خرچ برداشت کرتے ہیں اور تعلیم کے بعد اکثر صورتوں میں یہ لوگ بے کار رہتے ہیں۔ اس بے کاری کے ساتھ جب اسراف بھی جمع ہوجاتا ہے تو یہ مصیبت ناقابل برداشت ہوجاتی ہے لیکن اگر حسن اتفاق سے ملازمت مل بھی جائے۔ تب بھی فارغ البالی نصیب نہیں ہوتی بلکہ ایسی حالت میں فیشن کی پابندی اور معاشرتی ٹیم ٹماخ اور بھی بلائے جان بلکہ بلائے مال ہوجاتا ہے۔ کیوں کہ اسراف ایک ایسی عادت ہے کہ جس کی بدولت بڑی بڑی تنخواہ پانے والے عہدہ دار بھی عموماً تہی دست بلکہ مقروض رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اکثر اوقات وہ اپنی اولاد کی اچھی تعلیم کا انتظام کرنے سے اس مجبوری کے ساتھ قاصر رہے ہیں جیسا کہ اُن کے والدین نے ان کے واسطے کیا تھا۔ اپنے بعد کوئی سرمایہ پسماندوں کے لئے نہیں چھوڑ جاتے ہیں۔ اس بے مائگی کی حالت میں وہ اپنے خاندان یا قوم و ملک کی کیا خدمت کریں گے۔ اگر بچوں کو ابتدائے عمر میں ضبطِ نفس، کفایت شعاری، اور جفاکشی کی تربیت دی جائے اور والدین یا اساتذہ اپنی مثال اور نمونہ سے سادہ معاشرت کی خوبیاں اُن کے ذہن نشین کریں تو بہت سے نوجوان تباہ ہونے سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

مسلم اور اسراف کے مسئلہ کے متعلق میں نے کسی وقت میں ایک قطعہ کہا تھا اگر اجازت ہو تو اس موقع پر عرض کر دوں ؎

مسلم و اسراف ہر دو لازم و ملزوم ہست   ہر کہ مسرف نیست اندر این زمانہ شوم ہست

برکتِ اسراف ہیں درخانۂ اعیانِ قوم — خانہ ویران ست و روئے آشیانِ بوم ہست

جامعۂ ملّیہ

حضرات! اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ موجودہ تعلیم و تربیت میں نقائص ہیں لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ نقائص کی اصلاح میں مشکلات ہیں اور بغیر حکومت کے تعاون کے ان مشکلات کا دور ہونا ممکن نہیں اور حکومت کے ساتھ تعاون کا مسئلہ ایک ایسا مسئلہ ہے جیسا کہ جسم اور جان کا باہمی تعلق یا جیسا کہ ہندی میں کہا جاتا ہے کہ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ صرف تعلیم ہی کا مسئلہ نہیں بلکہ ہر ایک ترقی کے مسئلہ میں ملکی گورنمنٹ کے تعاون اور ملک میں امن و امان اور اطمینان اور آرام کی سخت ضرورت ہے۔ اگر یہ نہیں تو اذا فات الشرط فات المشروط کا مسئلہ ہے لیکن ملک میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ایک غیر معین مدت تک اصلاح کا انتظار نہیں کر سکتے تھے اور "آزاد تعلیم" کا بلند تخیّل اُن کو ترغیب دے رہا تھا کہ ایسی تعلیم گاہ قائم کی جائے جو حکومت کی مداخلت سے یکسر آزاد ہو اور اس میں اعلیٰ تعلیم کے ساتھ طلبار کی تربیت اور مذہبی پابندی کا بھی انتظام کیا جائے۔ چنانچہ اس تخیّل کا نتیجہ جامعۂ ملّیہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جو پہلے نیشنل یونیورسٹی کے نام سے علی گڑھ میں قائم ہوئی اور پھر دہلی منتقل ہو گئی۔

یہ تعلیم گاہ تحریک نان کوآپریشن کے زمانہ میں سیاسی اسباب سے عالمِ وجود میں آئی تھی گویا وہ ایک نیم سیاسی اور نیم تعلیمی ادارہ تھا۔

لیکن جب حالات بدل گئے تو کافی تجربے کے بعد اُس کے کارکنوں نے دانشمندی و تدبیر سے کام لے کر اس کو ایک خالص تعلیمی ادارہ بنا دیا۔ میرا خیال ہے کہ جن لوگوں کا مقصد انگریزی تعلیم سے حصول ملازمت نہیں ہے اُن کو اس تعلیم گاہ سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔ تعلیم کے متعلق ملک میں جس قدر تجربے بھی کئے جائیں وہ بہرحال نتائج کے لحاظ سے مفید ثابت ہوں گے۔ اور ان مختلف تجربوں کے بعد حکومت اور پبلک دونوں کو ایک جدید نظام تعلیم مرتب کرنے میں آسانی ہوگی۔ من جملہ ان ہی جدید تجاریب کے میں جامعہ ملّیہ دہلی کو بھی ایک خوش آیند تجربہ سے تعبیر کرتا ہوں۔

عربی تعلیم

حضرات! ہر قوم کا یہ اولین فرض ہے کہ وہ اپنی مذہبی زبان اور مذہبی علوم کو نہ صرف محفوظ رکھے بلکہ تعلیم و تدریس اور تالیف و تصنیف کے ذریعے سے ان کو ترقی دے۔ عربی مسلمانوں کی مذہبی بلکہ ایک حد تک قومی زبان ہے اس واسطے کہ اسلامی دورِ ترقی کی تمام معرکۃ الآرا تصانیف اسی جامع اور مقدّس زبان میں ہوئی ہیں۔ وہ مذہبی و مشرقی علوم کا سرچشمہ ہے۔ اس کے علاوہ آج بھی وہ ایک زندہ زبان ہے اور علمی حیثیت سے اُس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہر ایسے ملک میں جہاں مسلمان آباد ہیں ایک جماعت ہمیشہ موجود رہے جو اپنی زندگی عربی زبان اور مذہبی علوم کے لئے وقف کر دے۔

مجھے یہ دیکھکر خوشی ہوتی ہے کہ ہندوستان میں عربی علوم کی تعلیم کا سلسلہ اب تک حسن وخوبی سے جاری ہے اور ملک میں ایک ایسی جماعت موجود ہے جو مذہبی علوم کی خدمت کر رہی ہے۔ اگرچہ اس کا افسوس ہے کہ ہندوستان میں جو مختلف عربی مدارس جاری ہیں ان کی مالی حالت عموماً کمزور ہے اور وہ کوئی مستقل آمدنی یا سرمایہ محفوظ نہیں رکھتے۔ اس لئے عموماً ان کی زندگی خطرہ میں رہتی ہے۔ شمالی ہند کے موجودہ عربی مدارس میں اپنی قدامت اور مذہبی علوم کی تعلیم کے لحاظ سے مدرسۂ دیوبند کو خاص شہرت اور فضیلت حاصل ہے۔ یہاں کے فارغ التحصیل طلباء عموماً درس وتدریس کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ بے شبہ یہ مدرسہ ایک مفید دینی خدمت کر رہا ہے۔ لیکن ابھی اس میں اصلاح وترقی کی کافی گنجائش ہے۔ اگر یہاں کے طلباء کو جدید خیالات اور قوموں کے موجودہ مذہبی معتقدات سے آشنا کرنے کا موقع دیا جائے تو وہ اور زیادہ مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ درس وتدریس عربی کے بہت سے مدارس اس وقت جاری ہیں اور مجھکو معاف رکھا جائے اگر میں اپنی کوتاہی کی وجہ سے ہر ایک مدرسہ کا جدا جدا ذکر نہیں کر سکا۔ تاہم مدرسۂ قدیمیہ فرنگی محل لکھنؤ و مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور کا ذکر نہ کر دینا میں اپنی سخت ترین کوتاہی بلکہ فروگزاشت خیال کروں گا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں ان سب مدرسوں کی مالی حالت سقیم ہے اور دولت مند مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ ان مقدس درس گاہوں کی خدمت سے غافل نہ ہوں ۔

اے آنکہ بہ محنت بہم آوردی گنج — دانی کہ بود قافیۂ گنج تو رنج
تا چند کشی رنجِ حفاظت چوں مار — در منفعتِ خلق بکن صرف و مرنج

ندوۃ العلماء ہندوستان کی دوسری مشہور عربی تعلیم گاہ ندوۃ العلماء کا دار العلوم ہے جو اپنے مختلف خصوصیات کے لحاظ سے ہندوستان کے باہر تک شہرت حاصل کر چکا ہے۔ ندوۃ العلماء کی عظیم الشان مذہبی و تعلیمی تحریک گزشتہ صدی کے ربع آخر میں وجود میں آئی۔

اس عہد کے بعض علماء نے جو اپنی علمی فضیلت، مذہبی خدمات اور زہد و تقویٰ کے لحاظ سے ممتاز تھے اور اس کے ساتھ ہی زمانہ کی رفتار سے بھی آشنا تھے محسوس کیا کہ عربی تعلیم کے نصاب و طریقہ تعلیم میں زمانۂ حال کی ضروریات پیش نظر رکھکر اصلاح و ترمیم کی جائے۔ تاکہ یہ تعلیم ملک و ملت کے لئے پہلے سے زیادہ مفید ثابت ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں اصلاح تعلیم علوم عربی کا خیال تمام اسلامی ممالک میں پیدا ہو گیا تھا اور سب اپنی اپنی جگہ پر غور کر رہے تھے کہ کیا کرنا چاہیئے؟ بہرحال ندوۃ العلماء نے ہندوستان میں اپنی تحریک کے مطابق کام شروع کیا یعنی اس نے خود اپنا دار العلوم قائم کیا۔ تاکہ اس میں اصلاح یافتہ نصاب کے مطابق تعلیم دی جائے اور ایسے علماء تیار کئے جائیں جو موجودہ زمانہ کی ذہنیت اور حالات کو پیش نظر رکھکر صحیح طریقہ سے مذہبی و علمی خدمات انجام دے سکیں۔ مگر دنیا میں کوئی تحریک بغیر روپیہ کے کامیاب نہیں ہوتی۔ ندوۃ العلماء کو

اس تحریک کی اہمیت کے لحاظ سے کافی مالی مدد نہیں ملی۔ تاہم علمار نے اپنا کام جاری رکھا اور باوجود مخالفت اور موانع و مشکلات یہ تحریک اُمید سے زیادہ کامیاب ہوئی یعنی ندوۃ العلمار کے دارالعلوم نے ایسے علمار پیدا کئے جو اسلامی و قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں داخل ہو کر جوش و ہمت کے ساتھ نمایاں طریقہ پر علمی و مذہبی خدمت کر رہے ہیں۔

یہ لوگ فضلائے یورپ کے کارناموں سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہیں اور اسلام کے متعلق اُن کی علمی، تاریخی یا مذہبی تحقیقات کو آنکھ بند کرکے نہیں مانتے بلکہ خود انھوں نے علمی تحقیقات کا ایک دروازہ کھول دیا ہے۔ ندوہ کے فارغ التحصیل علمار کا بڑا کارنامہ دارالمصنفین ہے جس نے اپنی بلند پایہ علمی تاریخی مذہبی و ادبی تالیفات سے اُردو لٹریچر میں گراں قدر اضافہ کرکے اس کا وقار بہت بڑھا دیا ہے۔ یہ ایسی مستقل خدمت ہے جس سے قوم ہمیشہ مستفید ہوتی رہے گی اور جس سے اُردو زبان کی تالیف و تصنیف کا معیار بلند ہو جائے گا اس سلسلہ میں صرف ایک سیرۃ النبی کو لے لیجئے۔ اُردو زبان میں کبھی یہ خزانہ اس طرح منصۂ شہود پر نہیں آیا۔ تحقیقات و تدوین، مطالب، دلائل کی چستی، زبان کی شستگی، خط کی گلکاری، طباعت کی صحت، کاغذ کی صفائی، کس کس چیز کی تعریف کی جائے۔ مختصر یہ ہے کہ اس کے پڑھنے سے ایمان تازہ ہوتا اور فرحت بے اندازہ حاصل ہوتی ہے۔ غرض کہ ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا ست

اگرچہ ندوۃ العلماء کے فارغ التحصیل علماء جو ابھی تعداد کے لحاظ سے بہت تھوڑے ہیں زندگی کے مختلف شعبوں میں ہمت و حوصلہ سے کام کر رہے ہیں اور مجھے اُمید ہے کہ مستقبل قریب میں وہ ہندوستان اور بیرون ہند میں کارہائے نمایاں انجام دیں گے۔ دار المصنفین کا ماہواری رسالہ **معارف** جو دقیق نظری کے ساتھ علمی خدمت انجام دے رہا ہے اہل بصیرت سے وہ پوشیدہ نہیں ہے۔

ایجوکیشنل کانفرنس کی ضرورت

حضرات! اب میں اُس کانفرنس کے متعلق چند الفاظ عرض کرنا چاہتا ہوں جس کے اجلاس میں آپ تشریف فرما ہیں۔ کبھی کبھی کسی گوشہ سے یہ آواز آتی ہے کہ کانفرنس اپنا کام کر چکی اب اس کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح اور بہت سے ادارے ہیں، جن کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُن کی ضرورت نہیں۔ انگلستان میں ہاؤس آف لارڈز کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کی ضرورت نہیں۔ مگر باوجود اس کے وہ صدیوں سے قائم ہے اور بظاہر قائم رہتا معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے ہندوستان میں کونسل آف اسٹیٹ کی نسبت بھی یہ ہی خیالات ہیں۔ لیکن بظاہر جدید کانسٹی ٹیوشن میں یہ کونسل صرف برقرار ہی رہتی نہیں معلوم ہوتی بلکہ اُس کو اور ترقی ہوگی۔

اور اسی طرح وہ سب ادارے موجود ہیں جن کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ لیکن ایک بڑی جماعت ملک میں ایسی بھی ہے جس کے نزدیک ایجوکیشنل کانفرنس کی ہنوز ضرورت باقی ہے۔ دنیاوی ضرورتوں کے متعلق ہر شخص کا زاویۂ نگاہ مختلف ہے۔ چنانچہ ابھی ملک میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے نزدیک یک لخت انگریزی تعلیم ہی کی ضرورت نہیں اور بہت سے ایسے بھی ہیں کہ وہ مسلم یونیورسٹی کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ان کا یہ نظریہ ہے کہ مخصوص تعلیم گاہوں اور یونیورسٹیوں کا قیام فرقہ وارانہ جذبات پیدا کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب ہر جگہ سرکاری اسکول اور کالج موجود ہیں جن سے سب فائدہ اٹھا سکتے ہیں تو ہر فرقہ کو اپنی علیحدہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ مگر آپ دیکھتے ہیں کہ علی الرغم مخالفین مسلم یونیورسٹی فضل الٰہی سے موجود ہے اور انشاء اللہ صدیوں تک موجود رہے گی اور یوماً فیوماً ترقی کریگی ۔ یہ اس لئے موجود ہے کہ ملک میں ایک بڑی جماعت ایسی ہے جس کے نزدیک وہ بے ضرورت نہیں بلکہ ضروری اور اشد ضروری ہے۔

اسی طرح کانفرنس پر سر سید کے زمانہ سے اب تک معطّلی کا بھی اعتراض کیا جاتا ہے۔ کانفرنس کے عہدِ گزشتہ میں سب سے زیادہ کامیاب زمانہ وہ تھا جب اُس کا کام میرے مرحوم دوست صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کے ہاتھ میں تھا۔ صاحبزادہ صاحب جیسے مستعد و پُر جوش کام کرنے والے تھے

کون نہیں جانتا لیکن ان کا زمانہ بھی نکتہ چینی سے نہ بچا، حالانکہ ان کے عہد میں کانفرنس کے صدر دفتر کی شاندار عمارت تعمیر ہوئی، مستقل آمدنی میں اضافہ ہوا۔ اور اس کے دائرۂ عمل نے وسعت اختیار کی اور بہت سے مفید کام انجام دیئے۔

حضرات! ابھی تک نہ تو سب مسلمان تعلیم پا چکے ہیں نہ ہماری مخصوص تعلیمی مشکلات کا خاتمہ ہوا ہے۔ بلکہ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں وہ روز افزوں ہیں اور نہ پیچیدہ تعلیمی مسائل حل ہوئے ہیں۔ بلکہ ہنوز روزِ اول ہے۔ پھر میں نہیں سمجھ سکتا کہ کانفرنس کا کام کیسے ختم ہو گیا۔ مسلمانوں کو مختلف صوبوں میں تعلیم حاصل کرنے میں جو دشواریاں پیش آ رہی ہیں اُس کا کچھ اندازہ اُن تجاویز سے ہو سکتا ہے جو مختلف مقامات پر کانفرنس کے اجلاسوں میں پیش کی جاتی ہیں اور اجلاس کے بعد کانفرنس ان کے متعلق مختلف صوبوں کی حکومتوں سے مراسلت کرتی ہے۔ آخر کانفرنس کے علاوہ یہ کام کس کے کرنے کے ہیں اور اگر کانفرنس نہ ہو تو شخصی اور منفردانہ کوشش سے یہ کام کس طرح انجام پا سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب تک موجودہ نظامِ تعلیم ہندوستان میں قائم ہے مسلمان کانفرنس سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔

میرا خیال ہے کہ کانفرنس اگر اور کچھ کام نہ کرتی جب بھی محض مسلمانوں کا یہ سالانہ اجتماع جو کانفرنس کی وجہ سے ہوتا ہے ایک نہایت مفید کام ہے۔ آپ دیکھئے شریعت نے جماعت پنجگانہ، جمعہ، عیدین اور حج میں مسلمانوں کا اجتماع

ملحوظ رکھا ہے جو بجائے خود بہت سے مفید نتائج پیدا کرتا ہے۔ کانفرنس کے قیام سے پہلے مسلمانوں کا کوئی مقررہ پلیٹ فارم ایسا نہ تھا جہاں سب مسلمان خواہ وہ کسی صوبے اور کسی نقطۂ خیال کے ہوں سال میں ایک دفعہ جمع ہو کر آپس میں مل کر بیٹھیں اور قومی تعلیم اور قومی زندگی کے مسائل پر تبادلۂ خیالات کریں۔ اکثر ایسا ہوتا تھا اور اب بھی ہوتا ہے کہ بہت سے احباب جو اپنے دُنیوی مشاغل کے وجہ سے مدتوں تک باہم نہیں مل سکتے کانفرنس کی بدولت آپس میں مل لیتے ہیں اور یہ تجربہ ہے کہ یہ ملاقاتیں قومی مقاصد کے لئے بھی مفید ہوتی ہیں۔

خیر۔ یہ تو کانفرنس کا اخلاقی پہلو تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نے علمی، ادبی، تعلیمی اور اخلاقی پہلو سے بھی تقریباً نصف صدی کی گزشتہ مدت میں ملک وملت کی بہت مفید، سودمند اور نتیجہ خیز خدمت انجام دی ہے۔ کانفرنس کی متعدد رپورٹوں میں یہ خدمات وضاحت وتفصیل کے ساتھ درج ہیں۔ ومن لیشأ فلینظر۔ میں خود بھی کانفرنس کی خدمات سے ناواقف نہیں ہوں۔ کانفرنس میرے سامنے پیدا ہوئی، پلی، پرورش پائی، پروان چڑھی اور آج وہ اس حالت میں ہے جیسی کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ ممبری تو ہمیشہ ہی کی ہے۔ قرن اولیٰ کے جلسوں میں شریک بھی ہوا۔ بحیثیت جائنٹ سکرٹری ٹرسٹیان محمڈن کالج وپریسیڈنٹ ٹرسٹیان ووائس چانسلر مسلم یونیورسٹی جس حیثیت سے میں کانفرنس کی اسٹینڈنگ کمیٹی کا پریسیڈنٹ بھی تھا اس کے رگ وریشہ سے واقف ہوں۔ لہذا میں نے کانفرنس کے متعلق اس وقت جو کچھ عرض کیا ہے یہ ذاتی معلومات کی بنا پر ہے۔ خیالی پلاؤ یا قصہ وافسانہ نہیں ہے ؎

یارب کجاست محرم رازے کہ یک زماں
دل شرح آں دہد کہ چہ دید و چہا شنید

حضرات! کانفرنس نے ہندوستان کے علاوہ یہاں تک تعلیم کی تبلیغ و اشاعت کی ہے۔ اس کی تحریک سے جا بجا اسلامی تعلیم گاہیں اور بورڈنگ ہاؤس قائم ہوئے ہیں۔ اس نے مسلم یونیورسٹی کے قائم کرنے میں نہایت زبردست، نمایاں اور غیر معمولی حصہ لیا ہے۔ یونیورسٹی کی باقاعدہ تحریک سب سے پہلے اُسی کے پلیٹ فارم پر کی گئی اور جب اس تحریک نے کچھ ترقی کی تو کانفرنس نے اپنے دفتر کے سارے عملہ اور سفرا کی خدمات یونیورسٹی کے لئے وقف کر دیں۔ اس کے علاوہ مختلف مضامین کے ہزاروں پمفلٹ اس تحریک کی تائید و حمایت میں چھاپ کر تمام ہندوستان میں پھیلا دیئے۔ کانفرنس نے ایک لاکھ سے زیادہ روپیہ وظائف میں خرچ کیا۔ چنانچہ آج ملک میں سیکڑوں شخص ایسے موجود ہیں جنھوں نے کانفرنس کی مالی اعانت سے تعلیم حاصل کی اور اب برسرِ کار ہیں اور فکرِ معاش سے فارغ البال۔

کانفرنس اب بھی ان خدمات میں مصروف ہے۔ ہزاروں روپیہ سالانہ وظائف اور امداد مکاتب و مدارس پر خرچ کرتی ہے۔ سال بسال اجلاس منعقد کر کے مختلف تجاویز منظور کر کے مسلمانوں کی تعلیمی دشواریاں دور کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کے علاوہ جہاں اجلاس ہوتا ہے وہاں عموماً مقامی طور پر بھی کوئی تعلیمی خدمت انجام دیتی ہے، عمدہ و مفید تصنیفات کے ذریعہ سے اُردو لٹریچر میں مفید اضافہ کرتی ہے اس کے علاوہ کانفرنس گزٹ کے نام سے ایک بہت مفید تعلیمی و اصلاحی اخبار شائع کرتی ہے نیز اور خدمات بھی ہیں جن کی تفصیل میں اُس شخص کے لئے چھوڑتا ہوں

جو کانفرنس کی تاریخ مرتب کرے۔

حضرات! ان خدمات کے علاوہ یہ بھی پیش نظر رکھئے کہ کانفرنس آپ کی سب سے پرانی انجمن ہے اور یہ خصوصیت اسی کو حاصل ہے کہ اس کو سرسید مرحوم نے قائم کیا تھا اس کے ساتھ آپ کی بہت سی قومی روایات وابستہ ہیں اور اب اس نے ایک تاریخی اہمیت حاصل کر لی ہے اور امتداد زمانہ اور گوناگون خدمات نے اس کی پوزیشن کو بلند و مستحکم بنا دیا ہے۔ لہذا آپ کا فرض ہے کہ اس کی ترقی و کامیابی کے لئے سعی کریں۔ تاکہ وہ آپ کی حوصلہ افزائی سے اور زیادہ قومی خدمت کر سکے۔

دنیا کا کوئی کام ایسا نہیں ہے جس میں اصلاح کی ضرورت نہ ہو اور یقیناً کانفرنس بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتی لیکن طریقۂ اصلاح کیا ہونا چاہیئے؟ یہی مسئلہ ہے جو مابہ النزاع ہو سکتا ہے۔ میرا التماس بلکہ تجربہ یہ ہے کہ دوستی کے لباس میں ہر ایک اصلاح ممکن ہے لیکن معاندانہ اور مخالفانہ دعوئے اصلاح نہ صرف حوصلہ شکن بلکہ بے نتیجہ ہے العاقل تکفیہ الاشارۃ۔

حضرات! میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم ان تمام اداروں کی خدمات کا اعتراف کریں اور ان کی ہمت بڑھائیں جو کسی نہ کسی طریقہ سے ملک و ملت کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اس موقع پر میں اپنی اس وصیت نامہ میں اسلامیہ اسکول اٹاوہ کو بھی شامل کرنا چاہتا ہوں۔ اس دار الغربا نے خاموشی اور سلامت روی کے ساتھ جو خدمت تعلیم مسلمانان کی کی ہے۔ اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ میری دعا اور تمنا ہے کہ اس کا بڈھا، بے غرض، بے نفس، ثقیل السماعت قلیل البصارت بانی دیر گاہ زندہ و سلامت رہ کر اس ادارہ کی پوری ترقی کو اپنی کمزور آنکھوں سے دیکھ لے اور ساتھ ہی ساتھ

مذہبی تعلیم کی طرف تھوڑی سی مزید توجہ کرے۔ میری رائے میں اس مدرسہ کی مدد ہم پر لازم اور واجب ہے۔ یہاں ایک اور جملہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ تاریخ اپنے واقعات کا اعادہ کرتی رہتی ہے اگر اس موقع پر مولوی حاجی محمد سمیع اللہ خاں صاحب مرحوم کی ابتدائی تجویز کا بھی اعادہ ہوجائے جو انھوں نے علی گڑھ کالج کے قیام کی بجائے پیش کی تھی تو مسلمانوں کی تعلیم کے حق میں بہت مفید ہے یعنی علاوہ مسلم یونیورسٹی کے دیگر اسکول و کالجوں کے قابل اور غیر مستطیع مسلمان طلباء کو وظائف کا انتظام کر دیا جائے۔ اس سلسلہ میں اسی شہر کی مسلم اسٹوڈنٹ ہیلپنگ سوسائٹی کا ذکر نامناسب نہ ہوگا۔ یہ سوسائٹی نہایت مفید اور ضروری کام کر رہی ہے اور عام مسلمانوں کی مدد کی محتاج اور مستحق ہے۔

اسلامیہ بورڈنگ ہاؤس الہ آباد یونیورسٹی کالج ایک اور ادارہ ایسا ہی ہے کہ اس کو مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب مرحوم نے اپنے اسی اصول مذکورہ کے خاکہ پر تیار کیا تھا وہ بھی مستحق توجہ ہے۔

صوبہ متحدہ میں مسلمانوں کی تعلیم

حضرات! ہمارے صوبہ میں مسلمانوں کی جو تعلیمی شکایات ہیں وہ گزشتہ فروری میں اس صوبہ کے سربرآوردہ مسلمانوں نے لکھنؤ میں میرے ذاتی دوست آنریبل وزیر تعلیم کی خدمت میں پیش کی تھیں۔ مسلمانوں کو اس کے نتیجہ کا بے چینی کے ساتھ انتظار ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ حکومت ان مطالبات پر ہمدردانہ غور کرے گی۔

اس سلسلہ میں ہمیں لازم ہے کہ جناب آنریبل مسٹر سری واستو صاحب ایجوکیشنل منسٹر اور جناب آنریبل مسٹر میکنزی صاحب بہادر وزیر سررشتہ تعلیمات کا شکریہ ادا

کریں کہ ان جلیل القدر عہدہ داروں نے نہایت مہربانی، دل چسپی اور حسن اخلاق سے ہمارے معروضات پر توجہ کی اور مسلسل تین روز تک اس کام میں مصروف رہے۔

ہماری تعلیم میں بہت کچھ مشکلات ہیں اور وسائل محدود، اس لئے ہم کوئی جدید نظام تعلیم قائم نہیں کر سکتے۔ لہذا ہمارا فرض ہے کہ موجودہ نظام سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کریں اور اصلاح کے لئے جد و جہد جاری رکھیں۔ لیکن اس مقصد میں بغیر حکومت کی ہمدردی اور مدد کے کامیابی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے علاوہ اور امور کے جن سے ہندوستان کی ترقی و فلاح اور امن و امان وابستہ ہے، خصوصیت کے ساتھ تعلیم کے معاملہ میں ہم کو حکومت اور برادران وطن دونوں سے تعاون و رفاقت کی ضرورت ہے تاکہ ہم اطمینان و یکسوئی کے ساتھ تعلیم میں ترقی کر سکیں ورنہ وہی صورت ہو گی ؎

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی
ایں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان ست

خاتمۃ الکلام حضرات! اب یہ خطبہ یا وصیت نامہ خاتمہ پر آگیا ہے اور اب میں زیادہ آپ کے صبر و سکون کی آزمائش نہیں کروں گا۔ میں نے تعلیم و تربیت کے متعلق اپنے ذاتی خیالات آپ کے سامنے عرض کر دیئے ہیں۔ اگر ان خیالات میں کوئی بات علمی یا تعلیمی نقطۂ نظر سے صحیح نہ ہو تو میں قابلِ معافی ہوں۔ اس وجہ سے کہ (باصطلاح عوام یا باصطلاح تعلیم یافتگان مدارس انگریزی) آپ کو شکایت کا کوئی موقع نہیں جب آپ ایک "غیر تعلیم یافتہ" شخص کو "تعلیم یافتہ" مجمع کا صدر بنائیں گے تو اس کا نتیجہ اور کیا ہو گا۔

آپ تعجب سے سنیں گے کہ جس طرح میں خود غیر تعلیم یافتہ ہوں اسی طرح اوائل عمر اور ایام شباب میں مجھے صحبت بھی عرفِ عام کے "فرسودہ" اور "غیر تعلیم یافتہ بزرگ کی ملی جن سے مجھکو پبلک اور پرائیوٹ زندگی میں سابقہ پڑا وہ سر سید احمد خاں تھے۔ ان بیچارے کے پاس کسی یونیورسٹی کی کوئی ڈگری نہ تھی اور اُنھوں نے چھوٹا موٹا کوئی امتحان بھی پاس نہ کیا تھا۔ اس کے بعد نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق ہوا۔ آپ نے ان کا نام تو سُنا ہوگا۔ یہ دونو غریب بھی یونیورسٹی کی ڈگری سے محروم اور غیر تعلیم یافتہ تھے یہی حال میرے دوسرے بزرگ مولوی سمیع اللہ خاں صاحب مرحوم کا تھا۔ علی گڑھ کے سلسلے میں اکثر مولانا حالی اور علامہ شبلی نعمانی وغیرہم سے بھی صحبت رہی اور افادہ حاصل کیا۔ ان کے پاس بھی کوئی سند اور ڈگری نہ تھی۔ اب اس قسم کے غیر تعلیم یافتہ لوگوں کی صحبت کا جو نتیجہ ہونا چاہیئے وہ ظاہر ہے کہ آج جو کچھ میرے دل میں آیا باقتضائے اپنی غیر تعلیم یافتگی کے بلا پس و پیش کہتا چلا گیا۔

حضرات! مجھے اس موقع پر ایک لطیفہ یاد آیا۔ ایک کونسل کے جلسہ میں برادرانِ وطن میں سے میرے ایک دوست نے جو "اصطلاحی تعلیم یافتہ" تھے اپنی انگریزی تقریر کے سلسلہ میں یہ فرمایا کہ "فلاں معاملہ کے متعلق ہم تعلیم یافتہ لوگوں کا یہ خیال ہے"۔ میں نے فوراً ٹوکا اور سوال کیا کہ "تعلیم یافتہ" سے کیا مطلب ہے؟ اگر یہ مطلب ہے کہ انگریزی داں ہو اور کلکتہ یا مدراس یونیورسٹی یا ہندوستان کی کسی اور یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ہو تو پھر اس اعتبار سے تو جرمنی اور فرانس وغیرہ کے وہ لائق لوگ بھی جو انگریزی نہیں جانتے اور کسی انگریزی یونیورسٹی کے سند یافتہ نہیں ہیں غیر تعلیم یافتہ سمجھے جائیں گے لیکن اگر تعلیم یافتہ سے یہ مراد ہے کہ ایک شخص خواہ کسی زبان میں تحریر و تقریر کی قابلیت رکھتا ہے، روشن دماغ ہو، معاملات کو سمجھ سکتا اور اُن پر رائے دے سکتا ہو تو پھر بہت سے لوگ تعلیم یافتہ ہیں کسی خاص زبان یا ڈگری کی کیا قید۔ میں نے کہا اگر میرے دوست تعلیم یافتہ ہیں

تو میں اُن کے سامنے مثلاً شاہنامہ پیش کرتا ہوں۔ ذرا اس کو پڑھکر اس کے معنی اور مطالب مجھکو سمجھا تو دیں۔ اس طرح پر میں گویا کہ بازی جیت گیا۔ یہاں ایک اور افسوس ناک لطیفہ عرض کرتا ہوں۔ ابھی قریب تر زمانہ میں ایک ایم اے مسلمان صاحب سے ایک میرے ہندو معزز دوست نے الحمد شریف اور قل ھو اللہ کے معنی پوچھے تو میری ندامت اور حیرت کی حد نہ رہی کہ وہ جواب باصواب سے قاصر تھے لیکن میرے ان ہندو معزز دوست نے نہایت صحت اور قراۃ کے ساتھ یہ دونوں سورتیں پڑھیں اور اُن کے معنی اور مطالب اچھی طرح سمجھائے۔

حضرات! یہ تذکرہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ ہندوستان اور یورپ میں ایسے بہت سے علماء و ارباب کمال گزرے ہیں کہ اگرچہ وہ کسی یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ نہ تھے، لیکن علمی و تعلیمی خدمات میں اُن کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ یہاں تک کہ اُن کی تصنیفات یونیورسٹیوں کے کورس میں داخل ہیں اور اُن غیر ڈگری یافتہ لوگوں کی کتابیں پڑھکر لوگ ڈگریاں حاصل کرتے ہیں۔ اس بیان سے مجھے اپنے متعلق اظہار فضیلت مقصود نہیں۔ بلکہ اپنے عزیزوں سے یہ کہنا ہے کہ اپنی نظر بلند رکھیں اور علم کے دائرہ کو صرف مغربی علوم تک محدود نہ رکھیں اور بمصداق ع

متاع نیک ہر دُکّاں کہ باشد

جہاں بھی علم کی حقیقی دولت پائیں اُسے اپنی چیز سمجھ کر دامن بھرلیں۔ حدیث شریف ہے کہ "العلم ضالۃ المومن حیث وجدھا فھو احق بھا" یعنی علم مومن کی گم شدہ شے ہے اُسے جہاں پائے سے لے ے

کہ حکمت کو اک گم شدہ لال سمجھو　　جہاں پاؤ اپنا اُسے مال سمجھو

علیٰ ہذا القیاس۔

نصیحت جس کسی کے بھی منھ سے نکلے۔ اس پر اس کو سننا، سوچنا اور سمجھنا چاہیئے اور بلا لحاظ اس کے کہ وہ ایک تعلیم یافتہ صاحب ہیں یا مجھ جیسے غیر تعلیم یافتہ۔ اس پر عمل کرنا چاہیئے بمصداق قول "انظر الی ما قال ولا تنظر الی من قال" ؎

نصیحتے کنمت بشنو و بہانہ مگیر

ہر آنچہ ناصح مشفق بگویدت بپذیر

اب خاتمہ کلام پر میں اپنے دوستوں اور بزرگوں سے معافی چاہتا ہوں کہ میں نے اُن کی بہت سمع خراشی اور ہرزہ سرائی کی۔ بالخصوص اپنے نوجوان دوستوں سے دست بستہ معافی خواہ ہوں کہ وہ میری اس دریدہ دہنی پر مجھکو معاف فرمائیں۔ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اپنے نزدیک سچ اور واجبی خیال کر کے دلی خیر خواہی اور شفقت اور محبت کے اقتضاء سے کہا ہے ؎

گر نہ آید بسمع رغبت کس

بر رسولاں بلاغ باشد و بس

میں شکر گزار ہوں کہ جو کچھ میں نے عرض کیا آپ نے اپنے لطف و کرم اور اخوت اسلامی کے جذبات سے صبر و تحمل کے ساتھ سنا میرا دل خاص حالات و جذبات سے معمور تھا۔ ممکن ہے کہ اثر پذیری کی حالت میں میری زبان سے ایسے الفاظ نکل گئے ہوں جو کسی صاحب پر گراں گزرے ہوں تو وہ مجھکو عنداللہ معاف فرمائیں۔ وان تعفوا وتصفحوا وتغفروا فان اللہ غفور الرحیم

میرے عزیز نوجوانو! میرا یہ عقیدہ ہے اور خود سرسید کا بھی یہی مقولہ تھا

کہ مسلمانانِ ہند کے مستقبل کی تعمیر نونہالانِ قوم کے ہاتھوں میں ہے اس لئے میری یہی آرزو اور دعا ہے کہ میری آنکھوں کے تارے اور میرے جگر اور دل کے ٹکڑے نوجوانانِ قوم آسمان کے تاروں کی طرح افقِ ہند پر چمکتے ہوئے نظر آئیں، خوش رہیں، پھلیں پھولیں اور اُن کی آئندہ نسلیں اُن کی نیک روش کی تقلید کریں اور اُن پر فخر کریں۔ خدا بھی اُن سے راضی ہو اور مخلوق بھی اُن سے راضی رہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

ہم لوگوں نے بھی اپنے وقت میں قوم کی تھوڑی بہت خدمت کی تھی۔ مگر اب ہمارا دَور گزر گیا اور تمھارا دور آیا۔ کاش تم اس طرح خدمت کرو کہ جب تمھارا دَور گزرنے لگے تو تمھیں حسرت و ندامت نہ ہو کہ کچھ نہ کیا۔ غرض کہ اب قوم کی ساری اُمیدیں تم سے وابستہ ہیں اور مجھے اُمید ہے کہ تم قوم کو مایوس نہ کروگے۔ مجھے اس موقع پر اعیانِ قوم کی خدمت میں ایک نہایت عاجزانہ و مودّبانہ معذرت بھی پیش کرنا ہے وہ یہ کہ میری علالت کی وجہ سے اجلاس کانفرنس باوجود میرے اس اصرار کے کہ میری عدم شرکت مانع کار نہ ہونا چاہیئے۔ ملتوی کرنا پڑا اور بعض حضرات کو اس سے زحمت ہوئی۔ میرا عقیدہ اور مسلک تو یہ ہے کہ ؎

گماں مبر کہ تو مردی جہاں شود خالی
ہزار شمع بکشتند و انجمن باقی ست

بہرحال اجلاس دو مرتبہ ملتوی ہوا۔ اس کا مجھکو سخت افسوس ہے اور ندامت اور اُس کی بابت معافی خواہ ہوں۔ معذرت پیش کرتا ہوں ؎

والعذر عند کرام الناس مقبول

اب میں علامہ شبلی نعمانی کے دو شعروں پر اس وصیت نامہ کو ختم کرتا ہوں اور آپ سے رخصت ہوتا ہوں ؎

کئے تھے ہم نے بھی کچھ کام جو کچھ ہم سے بن آئے
یہ قصہ جب کا ہے باقی تھا جب عہدِ شباب اپنا
اور اب تو سچ یہ ہے جو کچھ اُمیدیں ہیں وہ تم سے ہیں
جواں ہو تم، لبِ بام آ چکا ہے آفتاب اپنا

وَاٰخِرُ دعوانا ان الحمد لِلّٰہِ رَبِّ العٰلمین وَالصَّلوٰۃ والسلام علیٰ سیّد المرسلین وآلہٖ واصحابہٖ الطاہرین المطہرین

۵۳۸۶